اُردو کی بنیاد میں اُردو کا حصہ
شاکر کنڈان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

اُردو کی بنیاد میں اُردو کا حصہ

شاکر کنڈان

اک الف پڑھو چھٹکارا اے
اک الفوں دو تن چار ہوے
پھر لکھ کروڑ ہزار ہوے
پھر اوتھوں باجھ شمار ہوے
ایس الف دا نکتہ نیارا اے

بابا بلھے شاہؒ

Scanned with CamScanner

اُردو کی بنیاد میں اُردو کا حصہ

شاکر کنڈان

مثال پبلشرز

رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

اشاعت : 2019

کتاب : اُردو کی بنیاد میں اُردو کا حصہ

مصنف : شاکر کنڈان
موبائل: ۰۳۲۱-۶۰۰۳۹۶۱

ناشر : محمد عابد

قیمت : 400 روپے

مطبع : سلیم نواز پرنٹنگ پریس

Urdu Ke Buniyad Mein Urdu Ka Hissa

by

Shakir Kandan

Edition - 2019

اہتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
+92-41-2615359, 2643841, Cell:0300-6668284
E-mail: misaalpb@gmail.com

شوروم

مثال کتاب گھر، صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

جو مجھے آسمان سے زمین پر لانے کا سبب بنے

اور جن کی دعاؤں سے میں آسمان کی سمت

سفر پر گامزن ہوا

''مجھے ایسا دل چاہیے جو فقط تیرا انتخاب کرے، ایسی روح

سے جس سے تیرے درد کی ہوک اٹھے۔ ایسا جسم جو صرف

تیری محبت کی تمنا کرے۔ ایسی آنکھ جو بس تجھے دیکھے۔''

کن فیکون تاں کل دی گل اے اساں اگے پریت لگائی
توں میں حرف نشان نہ آہا جدوں دتی میم گواہی
اجے وی سانوں اوہ پئے دسدے بیلے بوٹے کاہی
مہر علی شاہ رل تاہیوں بیٹھے جداں سک دوہاں نوں آہی

پیر مہر علی شاہؒ

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

’’اُردو کی بنیاد میں اردو کا حصہ‘‘۔۔۔جی ہاں! کچھ حیران کُن ہے۔۔۔لیکن تھوڑی سی توجہ سے اس کا درست مقصد اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ابتدا میں لفظ اُردو اصطلاحی معنوں یعنی زبان کے لیے استعمال ہوا ہے اور دوسری بار لفظ اُردو لغوی معنوں کا مفہوم دیتا ہے یعنی لشکر (فوج)۔اس کی یہ دونوں حیثیتیں ہر طرح کے شک سے بالاتر ہیں اور اس میں کسی بھی مؤرخ، ماہرِ لسان، یا دانشور کو اختلاف نہیں کہ اردو زبان ایک عسکری زبان ہے یعنی فوج ہی اس زبان کے وجود کا باعث بنی اور اس کے فروغ اور ارتقا میں ممد و معاون رہی۔

میں ایک مدت سے یہ سوچا کرتا تھا کہ فوج کی اردو زبان کے فروغ میں خدمات کے حوالے سے کوئی قابلِ قدر کام کر سکوں۔ اگرچہ ’’اُردو ادب اور عساکرِ پاکستان‘‘ کے عنوان سے تین جلدیں اور ’’اردو نعت اور عساکرِ پاکستان‘‘ کے عنوان سے نامکمل کام کر چکا ہوں لیکن قیامِ پاکستان سے قبل اردو زبان میں عساکرِ عالم نے جو خدمات انجام دیں اس حوالے سے کچھ کام کرنے کی ہمیشہ تمنا رہی۔

راقم کا نظریہ اُردو زبان کے بارے میں ماہرین کے پیش کیے گئے نظریات سے یکسر الگ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زبان کا تعلق دھرتی سے ہوتا ہے اور جس علاقے میں جو زبان بولی جا رہی ہوتی ہے اس کی بنیاد اس پہلے شخص نے رکھی ہوتی ہے جس نے وہاں پہلا لفظ زبان (منھ) سے ادا کیا ہوتا ہے۔ ہر علاقے کی زبان اسی پہلے لفظ، کلمے یا فقرے سے آگے بڑھتی ہے اور

حالاتِ زمانہ اسے تبدیل کرتے اور نیا وجود دیتے رہتے ہیں۔ اس کے نام بھی اسی نسبت سے بدلتے رہتے ہیں۔ یوں اردو زبان کا تعلق بھی اس دھرتی سے ہے جہاں یہ آج بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے، جزوی حیثیت سے نہیں بلکہ کلی حیثیت سے اپنی اہمیت کے ساتھ۔

راقم نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے جو موضوع منتخب کیا وہ اپنی اسی مندرجہ بالا خواہش کی تکمیل کے حوالے سے تھا۔ یعنی ''تقسیم ہند سے قبل اردو زبان و ادب کے فروغ میں عسکری اہلِ قلم کی خدمات کا تحقیقی مطالعہ'' لیکن جب Pre Defence Seminar میں اس پر بحث ہوئی تو باب اوّل پر اتفاق ہونے اور اسے سراہنے کے باوجود مقالہ میں اس کو شامل نہ کرنے کا فیصلہ دے دیا گیا۔ جبکہ یہی باب ہے جس میں بنیادی مباحث پر بات کی گئی ہے۔ لہٰذا اساتذہ کے مفید مشورہ کے مطابق اسے کتابی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔

میں اس حقیقت سے آگاہ بھی ہوں اور مجھے تسلیم بھی ہے کہ تحقیق میں کچھ بھی حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ اس میں کمی بیشی اور اصلاح کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ شروعات قدرے مشکل ہوتی ہیں لیکن جب اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا جائے تو آنے والے لمحے خود معاونت کرتے ہیں البتہ تبدیلیاں وقت کے ساتھ ہوتی رہتی ہیں۔ پہلے والے کام پر تنقید بھی ہوتی ہے اور تحقیق کے نئے زاویے بھی سامنے آتے ہیں۔

اُردو زبان و ادب میں عسکری اہلِ قلم کی خدمات کو کچھ عرصہ قبل ایک ایسا پہاڑ تصور کیا جاتا تھا جو سر نہ ہو سکے۔ کیونکہ تلاشِ بسیار کے باوجود اس حوالے سے کوئی کام میری نظر سے نہیں گزرا۔ ملٹری ہسٹری یا انگریزی میں Who is Who جیسی کچھ کتابیں ایسی میرے مطالعہ میں ضرور آئی جن میں انسائیکلوپیڈیا کی طرز میں کچھ ادبی شخصیات کے تعارف دیکھنے کو ملے لیکن وہ بھی خالصتاً عسکری شخصیات یا ان کی قلمی و ادبی خدمات کے حوالے سے نہیں۔ مزید یہ کہ کسی بھی اردو زبان کے مصنّف کا ذکر ان کتب میں نہیں تھا۔

مملکتِ عزیز، اسلامی جمہوریۂ پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر راقم الحروف کی ایک ادنیٰ سی کاوش ''اردو ادب اور عساکرِ پاکستان'' کی دو جلدیں ۱۴/ اگست ۱۹۹۷ء کو منظرِ عام پر آئیں۔ اسی موقع کی نسبت سے ''اُردو نعت اور عساکرِ پاکستان'' کی طباعت کا انتظام بھی ہوا۔ جبکہ ''اُردو ادب اور عساکرِ پاکستان'' کا ایک حصہ ۲۰۰۰ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس سے اتنا ضرور ہوا

کہ جو ڈیڈلاک تھا وہ ختم ہو گیا اور اس موضوع پر کام کیا جانے لگا۔ بریگیڈیئر (ر) عنایت الرحمٰن صدیقی کی کتاب ''اربابِ سیف و قلم'' گولڈن جوبلی کے سلسلے میں ہی شائع ہوئی۔ جس پر سنِ اشاعت ۱۹۹۷ء درج ہے لیکن یہ کتاب ۱۹۹۸ء میں کہیں منظرِ عام پر آئی۔ اس میں بہت سی ایسی شخصیات کو شامل کیا گیا جن کا عملاً کوئی عسکری کردار نہیں تھا۔ البتہ متعلقات میں سے تھے۔ مزید ایسی شخصیات کا ذکر بھی شاملِ کتاب ہے جن کا تعلق اردو زبان سے نہیں تھا۔ بہر حال یہ ایک اہم قدم ہے جو اُٹھایا گیا۔ بعد ازاں اسلم کھوکھر نے ایم فل کا مقالہ بعنوان ''عساکرِ پاکستان کے اُردو شعراء: تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' لکھا۔ جو نا پختہ بھی ہے اور نا معتبر بھی۔ بس ڈگری کے حصول کے لیے رواروی میں مقالہ لکھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مقالہ نگار نے اسے چھپوانے کی بجائے چھپانے کو بہتر سمجھا۔ راقم نے اس سلسلے میں اس کی بھر پور مدد کی تھی۔ یہاں تک کہ اس پر چلنے والے کیس کے سلسلے میں اپنے ادارے کے سامنے جوابدہ بھی ہونا پڑا۔ اسے کتب بھی مہیا کیں، لیکن ادبی بد دیانتی دیکھیے کہ موصوف نے شکریہ کے دو الفاظ بھی لکھنا گوارا نہیں کیا۔ بہر حال یہ برسبیلِ تذکرہ بات لبوں پر آ گئی ورنہ میں نے حصولِ تشکّر کے لیے اس کی مدد نہیں کی تھی۔ اور نہ ہی میں نے کبھی اس بابت سوچا ہے۔ محمد رفیق بلوچ کی کتاب ''عساکرِ پاکستان اور اردو شاعری'' یوں لگتا ہے ڈگری کے حصول کے لیے اس کا تحقیقی مقالہ ہے۔ لیکن میں نے جب اس کتاب کا مطالعہ کیا تو سر پیٹ لیا۔ محمد رفیق بلوچ نے مقالہ کی تکمیل میں مشورہ دینے والے اشخاص میں میرا نام بھی شامل کیا۔ جبکہ اگر یہ مقالہ ہے تو مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس کی اشاعت کے وقت پرنسپل صاحب (محمد رفیق بلوچ) کا ٹیلی فون مجھے آیا تھا۔ البتہ اس کے پبلشر نے اس کتاب کے دیباچہ کے لیے رابطہ کیا تھا جس پر میں نے معذرت کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام شبیر رانا سے دیباچہ لکھوانے کا کہا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ رانا صاحب نے میری کتب پڑھ رکھی تھیں بلکہ ایک سیٹ انہوں نے مستعار لیا تھا جو کئی بار واپسی کے تقاضے کے باوجود انہوں نے واپس نہیں کیا۔ بہر حال ان کے ساتھ بھی جو کچھ ہوا قابلِ افسوس ہے۔ ''عساکرِ پاکستان اور اردو شاعری'' راقم کی کتاب ''اُردو ادب اور عساکرِ پاکستان، جلد اوّل، حصہ اوّل'' کا تقریباً ۷۰ فیصد چربہ ہے۔ صرف موضوعات کے عنوان دے دیے گئے ہیں اور کاغذوں کا پیٹ بھرنے کے لیے بار بار انہیں کوائف کو دہرایا گیا ہے۔ اتنا کچھ نقل کرنے کے بعد حوالے بھی بہت کم دیے گئے ہیں۔ موصوف نے اتنا بھی نہیں کیا کہ جو غلطیاں دانستہ یا نادانستہ مجھ سے ہوئیں ان کو ہی درست کر دیتا مثلاً میں نے رحمٰن

کیانی کا رینک ونگ کمانڈر لکھا تھا اور یہ رینک ہفت روزہ ہلال سے نقل کیا تھا۔ بعد میں درست رینک کا علم ہونے پر بعد میں نے اصل رینک معذرت کے ساتھ درست کر دیا تھا لیکن محمد رفیق بلوچ نے کوئی اور کتاب دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ اسی طرح کچھ اقتباسات اس نے بریگیڈیر عنایت الرحمٰن صدیقی کی کتاب سے اڑائے ہیں۔

ڈاکٹر طاہرہ سرور کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''عساکرِ پاکستان کی ادبی خدمات'' اس سلسلے کی ایک اچھی کاوش ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ موصوفہ کا فوج سے عملاً تعلق نہ ہونے اور مبادیات سے عدم واقفیت کی بنا پر کچھ خامیاں رہ گئی ہیں۔ بہر حال مجھے یہ ماننے میں کوئی عار نہیں کہ تحقیق میں انہوں نے اپنی سی بھرپور کوشش کی ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل خالد مصطفیٰ کی کتاب ''وفیاتِ اہلِ قلم عساکرِ پاکستان'' ایک الگ سا کام ہے۔ اس میں انہوں نے بڑی فراخدلی سے یہ اعتراف کیا ہے کہ

> ''پاکستان میں وفیات نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ کا کام اور نام بہت مستند ہے۔ میں نے اکثر تواریخِ وفیات ان کی کتب سے لی ہیں۔
> کیپٹن (ریٹائرڈ) شاکر کنڈان نے ''اردو ادب اور عساکرِ پاکستان'' کے نام سے عساکرِ پاکستان کے اہلِ قلم کے کوائف کئی جلدوں میں جمع کر کے شائع کیے۔ میں نے ان کی کتب سے بھی استفادہ کیا۔''

محولہ بالا سارا تحقیقی کام قیامِ پاکستان کے بعد کے عسکری اہلِ قلم کے حوالے سے ہے۔ جس کے بعد یونیورسٹیوں میں اس حوالے سے کام کرایا جا رہا ہے لیکن تقسیم ہند سے پہلے کے عسکری اہلِ قلم بدستور نظر انداز ہیں۔ مجھے بڑے دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارا تحقیقی معیار خاص طور پر ڈگری کے حصول کے لیے کیا جانے والا کام بہت پست ہے، نہ تو سپروائیزرز کو اس موضوع کے بارے معلومات ہوتی ہیں اور نہ ہی ممتحن حضرات نے کبھی ایسے موضوعات کا مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ نیز نئی بات کو تسلیم بھی نہیں کیا جاتا۔ خواہ اس میں کتنا ہی دم خم ہو۔ بس کچھ شخصیات کو نوازنے کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں۔ بلکہ ایچ ای سی میں بیٹھے ہوئے اربابِ بست و کشاد کو بھی کچھ علم ہونا چاہیے۔ انہیں یہ پتا ہو کہ کسی خاص موضوع کے لیے ملک میں یا ملک سے باہر کس آدمی نے کتنا اور کیا کام کیا ہے۔ اگر درمیان میں کہیں اس شخص کی ڈگری کا مسئلہ پیش آتا ہے تو موضوع کی مناسبت سے اسے

اسسٹنٹ / معاون کا کردار سونپا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مجھے آج یہ کہنے میں بھی عار نہیں کہ ایچ ای سی کی پالیسیوں نے بھی مقالہ کے معیار کو کافی حد تک گرا دیا ہے۔ ایک سکالر پوری کتاب نقل کر دیتا ہے اور چند الفاظ کی تبدیلی سے اس مقالہ پر ڈگری لے لیتا ہے۔ ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ مقالات لکھنے کی فیس مقرر کر دی گئی ہے جس کے باعث ڈگری کے حصول کے لیے مقالہ نگار ایک سے ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ کر کے مقالہ لکھواتا ہے اور ڈگری حاصل کر لی جاتی ہے۔ اس بددیانتی پر آج تک کسی نے توجہ نہیں دی۔ مقالہ لکھ کر دینے والا شخص ممکن ہے میٹرک بھی نہ ہو۔ صرف کمپوزر ہو۔ مختلف کتب سے دو چار حوالے یکجا کر کے کاغذات کا پیٹ بھر دیا جاتا ہے۔ جسے درست طور پر چیک کرنے کا کوئی طریقہ یا بند و بست نہیں۔ اس سلسلے میں بڑے عجیب مقالات سننے اور دیکھنے میں آئے۔ مثلاً میں نے اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں سنا تھا کہ کسی زرعی یونیورسٹی میں اونٹ کی بیماریوں پر تحقیقی مقالہ لکھا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد بھینس کی بیماریوں پر ایک تحقیقی مقالہ کسی دوسری زرعی یونیورسٹی میں ایک سکالر کو الاٹ ہوا، اس نے اونٹ والے مقالے سے ہی اونٹ کو نکال کر بھینس لکھ کر جمع کروا دیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری اپنے نام کروالی۔ ماہنامہ نعت لاہور نے ایک شمارہ سرقہ یا توارد کے حوالے سے شائع کیا تھا جس میں ایسے ہی ایک مقالے کا انکشاف کیا گیا کہ ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر قاضی شہاب الدین نے ''اردو میں میلاد نامے'' کے عنوان سے ناگپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا تھا۔ غالباً ۱۹۹۰ء کے بعد اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے ڈاکٹر محمد مظفر عالم جاوید نے ''اُردو مولود نامے۔ تحقیق، تنقید اور تاریخ'' کے عنوان سے مقالہ جمع کروایا جس پر اسے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی اور یہ مقالہ اُس پہلے والے مقالہ کا سرقہ تھا۔

شخصیات پر جب مقالہ لکھا جاتا ہے تو پہلا باب جو عموماً تعارفی ہوتا ہے۔ وہ اس صورت میں جب کہ ادبی جہتوں کے حوالے سے الگ الگ مقالات ہوں تو کاپی پیسٹ (copy paste) کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح روایت کا باب بھی مکمل چربہ ہوتا ہے۔ چربے والے تو کئی مقالے دیکھنے کو ملے لیکن کچھ عرصہ پہلے سرقہ والا ایک مقالہ بھی دیکھنے کو آیا۔ تقریباً چار سال پہلے ایک سکالر نے ایک ادیب کی کسی ادبی جہت پر کام کیا۔ جس کا پہلا باب تعارفی تھا لیکن بدقسمتی، HEC کی نااہلی یا یونیورسٹی کی عدم دلچسپی سے ابھی تک اس اسکالر کا زبانی امتحان نہیں ہو پایا۔ چار سال بعد دوسری یونیورسٹی سے اسی ادیب کی ایک دوسری جہت پر کام ہوا تو سکالر نے پہلا باب پہلے سکالر کے

مقالے سے اٹھا کر اپنے مقالے میں لگا دیا۔ اسے کیا کہا جائے گا۔ مجھے علم نہیں۔

اس طرح کی بے قاعدگیاں اپنی جگہ لیکن مقالہ میں حوالہ دینے کا جو اہم مرحلہ ہے۔ اس پر بھی راقم کے تحفظات ہیں۔ کچھ عرصہ قبل کے تجربات سے اب ذرا بہتری دکھائی دیتی ہے۔ حوالہ دینے کے طریق کا ایک فطری عمل ہے۔ یورپ میں جو کتب شائع ہوتی ہیں ان کے ٹائٹل پر اکثر پہلے لکھاری کا نام اور پھر کتاب کا نام آتا ہے۔ اسی طرح اندر والے صفحے پر کئی بار سن اشاعت پہلے ہوتا ہے اور بعد ازاں ناشر اور شہر کا نام آتا ہے لہٰذا جب وہ حوالہ دینے کے عمل سے گزرتے ہیں تو اسی ترتیب کو برقرار رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں اردو کی کتب کو اگر دیکھیں تو سرورق پر پہلے کتاب کا نام لکھا جاتا ہے۔ اس سے نیچے مصنف (وغیرہ) کا نام ہوتا ہے۔ اندر والے صفحے پر اسی طرح پہلے کتاب، پھر مصنف اور اس کے نیچے ناشر کا نام لکھ دیا جاتا ہے۔ اور ضابطے والے صفحے پر سنِ اشاعت ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ یہاں ترتیب قدرے الگ بھی ہو جاتی ہے۔ یعنی کتاب کا نام، مصنف کا نام، سنِ اشاعت اور آخری سطر میں پبلشر کا نام اور بعد میں جو صفحہ ہو۔ گویا یہ ایک فطری طریقہ ہے اور ہمارے ہاں اسی طریقہ پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ ایک مثال سے یہی بات میں واضح کرنا چاہوں گا۔

''چند نعت گویانِ اردو، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء ص ۳۵''

اس طریقے سے مصنف کا نام ٹکڑے ٹکڑے نہیں کرنا پڑتا۔ مکمل نام آتا ہے جو اس کی پہچان ہے۔ حوالہ چونکہ ہم کتاب کا دیتے ہیں لہٰذا اوّلیت کتاب کو دی جانی چاہیے۔ چونکہ ہمارے ہاں بلکہ ہر جگہ ناموں میں یکسانیت بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ جبکہ ایک نام کی اکثر ایک ہی کتاب ہوتی ہے یا پھر دو یا تین۔ اس سے زائد ایک نام کی آپ کو مختلف لکھاریوں کی کتابیں بہت کم ملیں گی۔ جبکہ ناموں میں یکسانیت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک بار میں نے اقبال تخلّص یا نام کی شخصیات گنیں جو ڈیڑھ سو کے لگ بھگ تھیں۔ ممکن ہے بلکہ اس سے زیادہ ہوں گی جن کا احاطہ میرا علم نہیں کر سکتا۔ اگر پروفیسر شیخ محمد اقبال لیں تو پانچ شخصیات کو میں جانتا ہوں جن میں سے پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کے نام سے ادب میں موجود تین شخصیات میرے علم میں ہیں۔ اسی طرح عامر سہیل نام ہے تو چار عامر سہیل کو تو میں جانتا ہوں جو ادب میں موجود ہیں لیکن ان کی کتب کے عنوان ایک جیسے نہیں۔

میرا ایم فل کا مقالہ ''شیر افضل جعفری کے کلیات کی تدوین مع فرہنگ'' تھا۔ شیر افضل جعفری کو پڑھنے والا ہر قاری جانتا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں پنجابی زبان کے بہت

سے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ میرا وائیوا لینے والی شخصیت نے ایک اعتراض کیا کہ مقالہ میں پنجابی الفاظ بہت زیادہ استعمال کیے گئے ہیں۔ میں انہیں کیا جواب دیتا کہ تدوین متن کو تبدیل کرنے کا اختیار سکالر کے پاس تو نہیں۔

بہر حال اس طرح کے بہت سے اسقام ہمارے ہاں موجود ہیں جن پر HEC کو کام کرنا پڑے گا۔

میں نے جب ''تقسیمِ ہند سے قبل اُردو زبان وادب کے فروغ میں عسکری اہلِ قلم کی خدمات'' پر کام کرنے کا ارادہ کیا تو بہت سی مشکلات سے واسطہ پڑا۔ لیکن میرا ایمان ہے کہ مثبت کام کی ابتدا انسان کرتا ہے اور اس کی نیت ہو تو تکمیل اللہ رب العزت فرماتا ہے۔ نیز عسکری زندگی نے مجھے کم از کم اتنا ضرور سکھایا ہے کہ دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں۔ میرے سامنے نہ تو زمین کی حد تھی اور نہ ہی زمان کی۔ یعنی تقسیمِ ہند سے پہلے کا تمام زمانہ جس کی ابتدا حضرت آدمؑ سے ہوئی میرے مقالے کا زمانہ تھا اور افق سے آفاق تک زمین پر بسنے والے تمام وہ لوگ جن کی خدمات اُردو زبان وادب میں تھیں بشرطیکہ انہوں نے فوج کی وردی پہنی ہو یا اپنے عہد میں روایات و رسومات کے مطابق فوج میں خدمات انجام دی ہوں، شامل تھے۔ ہاں اس ضمن میں عسکریت کے حوالے سے کچھ تحفّظات کو ضرور سامنے رکھا گیا۔ نیز مجھے اردو زبان کے آغاز اور عسکری زندگی کے آغاز کا تعین بھی کرنا تھا۔

ماضی کی تحقیق میں آپ کے پاس معلومات رعلم کے حصول کے لیے صرف کتب ہی ذریعہ ہیں۔ جنہیں میں نے کھنگالا لیکن جب بھی کسی باعلم سے بات کرتا وہ مجھے ڈارون کی فضولیات میں اُلجھا دیتا۔ جب کہ میرے پاس ان فضولیات سے کروڑ ہا درجہ بہتر قرآنِ حمید کے مستحکم اور اٹل دلائل تھے۔ پھر توریت، زبور اور انجیل سے بہتر کوئی مواد نہیں تھا جو ماضی بعید یا عہدِ قدیم کے حالات سے میری تشفی کرتا۔ مجھے قرآنِ مجید پر مکمل ایمان اور دیگر صحائف پر اس میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث ایمان کے جز میں سے جزوی اعتماد تھا۔ جبکہ ڈارون اور آئزک ایسی موف وغیرہ کے نظریات میرے لیے بکواسات سے زیادہ کچھ نہیں تھے۔ اس طرح تو کوئی بھی پاگل دو پتھر اٹھا کر کہہ سکتا ہے یہ پتھر آج سے ۱۰ ارارب سال پہلے انسان کے گھٹنے تھے تو کیا اس کو سچائی تسلیم کر لیا جائے یا کوئٹہ شہر سے دور پہاڑ پر لیٹی نظر آنے والی بیوٹی کوئین کے بارے اگر کہا جائے کہ آج سے ۱۰ ہزار سال پہلے

وہاں پتھر ہوئی تھی تو اسے سچ مان لیا جائے۔ اسی طرح جب زبان کے بارے میں کسی سے گفتگو کرتا تو وہ بھی مفروضوں میں اُلجھا دیتا۔ جبکہ میرے پاس اس سے بہتر حوالے موجود ہیں۔ کہ انسان کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کسی زبان میں تو بات کی تھی۔ حضرت آدمؑ پر جو صحائف نازل ہوئے وہ کسی زبان میں تو تھے آپؑ نے اور بعد ازاں حضرت شیثؑ، حضرت انوشؑ وغیرہ نے جو تبلیغ کی وہ کسی زبان میں تو تھی لہٰذا میں نے ماما اور ڈنگ ڈانگ جیسے نظریات کی بجائے صحائفِ سماوی سے رجوع کیا جن سے مجھے معلوم تاریخ سے پہلے کی معلومات اخذ کرنے میں کوئی دِقت پیش نہیں آئی۔ دراوڑوں کے بعد کے حالات تقریباً کتب میں موجود ہیں اختلافات اپنی جگہ لیکن ان سے مدد لی جا سکتی ہے۔ ہاں! یاد آیا ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ ''مارنے والے کے ہاتھ کو روکا جا سکتا ہے۔ بولنے والے کے منہ کو بند نہیں کیا جا سکتا۔'' دانشورانِ وقت کو میرے اس دیباچہ (بسم اللہ) پر ایک اور اعتراض بھی ہو سکتا ہے۔ کہ یہ باتیں جو تحریر کی گئی ہیں۔ مقالہ جمع ہونے کے بعد کی ہیں۔ عرض ہے کہ مقالہ ابھی جمع نہیں ہوا جبکہ میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں اور ان شاء اللہ کتاب زبانی امتحان سے پہلے مارکیٹ میں آجائے گی۔ کیونکہ مجھے ایسا کوئی خوف نہیں جو عام سکالر کو ہوتا ہے۔ میں چند سال یونیورسٹی میں پڑھانے کے بعد اساتذہ کی نفسیات سے بھی آگاہ ہو چکا ہوں۔ لہٰذا یہ خیال دل میں نہ لایا جائے کہ میں ڈگری کے حصول کے باعث سچ سے پیچھے ہٹ جاؤں گا۔ میرا مکمل ایمان ہے کہ اللہ رب العزت نے جو عطا فرمانا ہوتا ہے اس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی اور جو عطا نہیں فرمانا ہوتا اسے کوئی دے نہیں سکتا۔

''اردو کی بنیاد میں اردو کا حصہ'' اگرچہ ایک تسلسل اور روایت کا بیانیہ ہے لیکن اس میں کئی نام جیسے محمد بلاقی خاکسار، اللہ وردی خان جلیس، میر تقی میر، عبدالصمد شیفتہ، منشی جگناتھ خوشتر، فارغ دہلوی، حلیم امروہوی، شمس الدین سوزاں، پیر محمد فنا، شیخ عوض علی تنہا، مولانا کفایت اللہ کافی، منشی خیراتی لال شگفتہ، سید سجاد حسین، دیوان خان بہادر، نواب مرزا داغ، چھیتر مل مجبور، محمد یوسف علی خان عزیز، محمد نور احمد تنویر، محمد صادق علی جعفری، نواب بہادر یار خلق، ظریف جبلپوری، حاجی محمد حسین کنجاہی، حیرت جلالپوری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم وغیرہ جن کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے فوج سے تو تھا لیکن کیا یہ باقاعدہ یا بے قاعدہ عملی فوج کا حصہ تھے اس بارے میں واقفیت اور تشکیک کے باعث انہیں مختصر بحث کا حصہ بنایا گیا ہے۔

مقالہ میں نیا پن پیدا کرنے کے لیے اس کا پیش لفظ بعنوان ''بسم اللہ'' میں نے منظوم تحریر کیا تھا۔ لیکن اسے بھی شرفِ قبولیت نہ ملا۔ گویا یہاں وہ پیش لفظ لکھ دینا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

بِ اسم اللہ۔۔۔میں کہتا ہے
مجھے بس چند ہی اکھر
کہ میں نے پوری کاوش سے
بڑی ایمان داری سے، بڑی محنت، مشقّت سے
مقالہ پایۂ تکمیل تک پہنچایا
لیکن
اس میں اب بھی خامیاں پاتا ہوں
اور محسوس کرتا ہوں
کہ میں انصاف کر پایا نہیں جو کرنا چاہیے تھا
مگر اس کام کو
میں جانتا ہوں
کوئی
شاید کر نہیں پاتا
کہ یہ ہے کام جوکھم کا
سو یہ توفیق میرے رب نے میرے نام لکھی تھی
مگر اتنا بڑا اور اس قدر وسعت کا، کوئی، کام کرتا ہے
تو یہ سب کچھ تو ہوتا ہے
کئی کج فہمیاں، اغلاط اور کچھ تلخیاں تو آ ہی جاتی ہیں
بہت سی ٹرمز ایسی اس مقالے میں بھی آئی ہیں
سمجھنے میں جنہیں کچھ لوگ شاید۔۔۔کچھ ادق جانیں
سو اس سے معذرت کہ یہ الگ اک بحث ہووے

مجھے یہ علم ہے اس میں کئی اک عذر بھی ہوں گے
بہت سے اعتراض اس میں اُٹھائے جائیں گے
لیکن
میں اتنا جانتا ہوں
اعتراض و عذر تو ہر اس طرح کے کام میں موجود ہوتے ہیں
یہ اک تحقیق ہے
تحقیق میں "آخر" نہیں ہوتا
یہ ایسا سلسلہ ہے جو کہیں پر رک نہیں سکتا
سوا مکانات میں۔۔۔اس پر کہیں یہ بحث بھی کی ہے
کہ اس موضوع پر، رجحان پر، عسکر، عساکر پر
بہت سا کام کرنے کے لیے۔۔۔موجود ہے
جس پر کوئی آئندہ کا اہلِ قلم، باعلم، دانشور،
محقق، اپنی محنت اور قلم کو آزمائے گا
اسے آگے بڑھائے گا
میں آخر میں بہت ممنون ہوں اپنے معلّم کا۔۔۔میں اپنے رہنماؤں کا
میں اپنے بیوی بچوں کا
مگر ان سب سے بڑھ کر
اپنے رب کا۔۔۔اپنے اللہ کا
کہ جس نے مجھ کو ہمت اور طاقت دی
مجھے تحقیق سے اور علم سے اتنا نوازا۔ جو
مری ہستی سے بڑھ کر ہے
جو میری استطاعت سے زیادہ ہے
مگر یہ دین ہے اُس کی
وہ جس کو دے۔۔۔وہ جتنا دے

الٰہی بندۂ ناچیز تیرے در پہ سجدہ ریز ہوتا ہے
تجھی سے مانگتا ہے۔ اور
تیرے در سے ہی ہر شے کا طالب ہے
تجھی سے عزت و عظمت کی، عصمت اور شہرت کی
یہاں پر بھی، وہاں پر بھی
تیرے اکرام کی، تیری عنایت کی
تیری محبوب ہستی ﷺ سے محبت اور الفت کی
دعا کرتا ہوں
اے غفار ـــــ اے رب العلیٰ ـــــ اے مالکِ کون و مکاں
تو ہی تو داتا ہے ـــــ تو دیتا ہے ـــــ تو ہی دے گا

شاکر کنڈان
(سرگودھا)

☆☆☆

شکر کا طریقہ یہ ہے کہ گلہ نہ ہو۔ بندوں کا گلہ نہ ہو
خالق کا گلہ نہ ہو، زندگی کا گلہ نہ ہو، شب و روز
کا گلہ نہ ہو۔ زندگی کو حاصل اور محرومیوں کی شکل
میں نہ لو، بلکہ زندگی میں اپنی عافیت کو، عطا کرنے
والے محسنوں کو تلاش کرو اور محسن کے احسان کا
شکریہ ادا کرو۔

(واصف علی واصف)

عروسِ زندگی کی تاب و زینت جس زباں سے ہے
اسی خود کام فطرت کا اچھوتا نام ہے اُردو
مسلسل ارتقائے آدمیت اس سے مظہر ہے
یہ قیدِ نطق ماجدؔ رہبرِ اقوام ہے اُردو

(ماجدالباقری)

اُردُو[1] کی بنیاد میں اُردُو[2] کا حصہ

۱۔ زبان ۲۔ لشکر (فوج)

چہ پُرسی از کجایم ، چیستم من
بخود پیچیدہ ام تا زیستم من
دریں دریا چو موجِ بے قرارم
اگر برخود نہ پیچم نیستم من

(اقبالؒ)

ا۔ بنیادی مباحث

(انسان، قلم، تحریر، ہتھیار، فوج، زبان)

اللہ رب العزت نے حضرت آدم علیہ السّلام کی تخلیق فرمائی اور ان سے سلسلۂ آدم کا آغاز فرمایا۔ حضرت آدمؑ پہلے نبی اور رسول تھے اور اس حقیقت پر پوری نسلِ آدمؑ متفق ہے۔ ''رسول اسے کہا جاتا ہے جس پر جبریلِ امین کے ذریعے وحی آتی ہو، صاحبِ کتاب و شریعت ہو، تبلیغِ رسالت کا اسے حکم ملا ہو۔''[۱] آپ کی زندگی میں ہی آپ کی نسل اس حد تک پھیل گئی تھی کہ گاؤں آباد ہو گئے۔ قائین نے جو شہر بسایا اس کا نام اپنے بیٹے 'حنوک' کے نام پر رکھا۔''[۲] آپ کی عمر ایک سو تیس برس کی تھی جب کہ حضرت شیثؑ پیدا ہوئے۔ اور حضرت شیثؑ کی پیدائش کے بعد حضرت آدمؑ آٹھ سو برس تک زندہ رہے۔ آدمؑ کے کل ایامِ زندگی ۹۳۰ برس ہوئے۔'' [۳] کئی روایات میں آپ کی عمر ایک ہزار سال بتائی گئی ہے۔''[۴] آپ کی نبوت اور رسالت کے دوران ایک روایت کے مطابق آپ پر دس صحیفے نازل ہوئے۔''[۵] آپ نے اپنی حیات میں ہی اپنے بیٹے حضرت شیثؑ کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔ اور جب حضرت شیثؑ کو رسالت و نبوت سے سرفراز فرمایا گیا تو ''ان پر ۵۰ صحیفے نازل ہوئے۔''[۶] یہ بات باالتفاق علماءِ نسب ثابت ہو چکی ہے کہ ابوالبشر (آدمیوں کے باپ) آدمؑ ہیں اور انہیں کی اولاد کی نسل سے حضرتِ نوحؑ تک تعمیرِ عالم اور زمین آباد ہوتی رہی اور جناب نوحؑ تمام عالم کے ابوالبشر ثانی ہیں۔ ان کا نسب تورات اور ماہرِ انساب کے اتفاق سے نوح ابن لامک ابنِ متوشلخ ابنِ خنوخ ابنِ یرد ابنِ مہلائل ابنِ قائن ابنِ انوش

ابن شیث ابنِ آدم علیہ وعلیٰ نبینا والصلوٰۃ والسلام ہے۔[۷]

میں تخلیقِ آدم پر اس لئے بات نہیں کروں گا کہ آج سائنس نے بھی ان تمام مفروضوں کو باطل قرار دے دیا ہے، جن میں کبھی بندر کی اولاد، کبھی خود کو جانور ثابت کرنے کے دلائل، کبھی ذہن، روح اور نفس کے تذکرے، کبھی مادی جسم کو ہی آخری حقیقت سمجھنا جیسے مفروضے شامل رہے اور قرآن یا دیگر صحائف کو (نعوذ باللہ) پسِ پشت ڈال دیا گیا نیز سائنس اور نظریۂ ارتقا کو ہی حرفِ آخر تسلیم کیا جانے لگا۔ آج سائنس نے مان لیا ہے کہ انسان ہر لحاظ سے منفرد ہے۔ نیز ''DNA کی دریافت اور کوانٹم جمپ (Quantam Jump) یا کیمبری دھماکہ (Cambrian Explosion) جیسی تھیوری سے ثابت ہو گیا ہے کہ کوئی مخلوق ارتقاء یافتہ نہیں اور جدید تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ تمام انسان ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔ اس دریافت سے بھی اس نظریے کی نفی ہوتی ہے کہ انسان کے آباؤاجداد حیوان تھے۔''[۸]

حضرت آدمؑ کی حیات میں اگرچہ قلم اور تحریر رواج پا چکے تھے کیونکہ حضرت آدمؑ نے نورِ محمدی ﷺ کی حفاظت کے بارے میں ایک عہد نامہ تحریر کرایا تھا کہ نورِ محمدی کو پاک رحموں اور پاک پشتوں میں پہنچایا جائے۔''[۹] چونکہ حضرت آدم کو تخلیق سے پہلے عالمِ ارواح ہی میں علم سکھا دیا گیا تھا۔''[۱۰] اور پھر قرآن مجید کا نزول جب شروع ہوا اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو جہاں پڑھنے کا حکم تھا وہیں آگے چل کر ارشاد ہوا۔ ''پڑھو! اور تمہارا رب کریم ہے اور جس نے قلم سے علم سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔''[۱۱] قرآن مجید نے ہی ہم پر کتاب کی اہمیت کو واضح کیا اور ابتداء میں ہی یہ فرمایا ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔''[۱۲] لہٰذا ہمارے لیے سب سے بہترین، سب سے افضل ترین رہنما کتاب (قرآن ہی) ہے۔ اور ہم جوں جوں اس کا مطالعہ کرتے ہیں کتاب، قلم، علم، لکھنے اور پڑھنے کا احساس عین الیقین سے حق الیقین کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یقین (ایمان) غیر متزلزل اور لامبدل ہو جاتا ہے جب یہ ارشاد ہوتا ہے۔ ''قسم ہے قلم کی اور اس کی جو لکھتے ہیں۔''[۱۳] سو یہ مان لینے کے بغیر ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں کہ لکھنا، پڑھنا اور حصولِ علم انسان کے ساتھ اس کی تخلیق کے وقت سے جڑا ہے۔''[۱۴] قلم اور اہلِ قلم کے بعد عساکر کو قرآن کے اندر سے جب تلاش کرتے ہیں تو جا بجا قتال اور شہادت کا بیان ملتا ہے۔ دشمن سے جنگ اور جنگ کے لیے تیاری کے احوال،

کسی منظم گروہ کے بنانے اور تیار کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

''اور دشمنوں کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اس کے ذریعہ سے تم رعب جمائے رکھو اُن پر جو کہ اللہ کے دشمن ہیں اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی۔''[۱۵] بات یہیں تک محدود نہیں رہی میدانِ جنگ کے گھوڑوں حتیٰ کہ حملہ کرنے کے وقت کی قسم کھا کر جنگ، فوج اور فوج کے زیرِ استعمال اشیاء کی عظمت کو بڑھا دیا۔ ارشاد فرمایا:

''ہانپتے ہوئے، دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم، پھر ٹاپ مار کر آگ جھاڑنے والوں کی قسم، پھر صبح کے وقت دھاوا بولنے والوں کی قسم، پس اس وقت گرد و غبار اڑاتے ہیں۔ پھر اسی کے ساتھ فوجوں کے درمیان گھس جاتے ہیں۔''[۱۶]

حضرت آدمؑ کے زمانے میں ہی انسانی مخالفت و دشمنی اور قتل کی ابتدا ہو چکی تھی۔ جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو پتھر سے شہید کر دیا تھا۔ یہ عداوت، دشمنی کا پہلا منظر چشمِ فلک نے دیکھا اور فرشتوں کے اس شک کی تائید ہونے لگی جو انھوں نے انسان کے فساد پھیلانے کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے حضور عالمِ ارواح میں عرض کیا تھا۔ پھر آپؑ (حضرت آدم) کی حیات میں ہی لوہے کا استعمال بھی شروع ہو گیا جو ہتھیاروں کی ساخت وغیرہ کی طرف اشارہ ہے۔ قابیل کے بیٹے حنوک کی پانچویں نسل میں ''توبل قائین لوہار تھا اور تمام لوہاروں اور سگروں کا باپ''[۱۷] تھا۔

حضرت آدمؑ کی اولاد اور ان کی کئی پشتیں اس زمین کے مختلف علاقوں میں آباد ہو چکی تھیں ان کی تعداد چالیس ہزار نفوس بتائی جاتی ہے جو آپ کی رحلت کے وقت آباد تھیں۔ بڑھتی آبادی میں آپس کی ناچاقیاں چھوٹے موٹے لڑائی جھگڑوں کو جنم دے چکی تھیں۔ خیر اور شر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ پتھروں کو رگڑ کر اور گھڑ کر ہتھیار بنانے کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جسے قدیم حجری عہد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس عہد میں جو اوزار بنائے گئے تھے ان میں ''کلہاڑیاں، بھالے، زمین کو کھودنے کے اوزار، پھینک کر مارنے کے گول پتھر''[۱۸] شامل تھے۔ گویا قلم اور ہتھیار ساتھ ساتھ چل رہے تھے جہاں ایک طرف ہتھیار تیار کیے جا رہے تھے اور انہیں لڑائیوں میں استعمال کیا جا رہا تھا وہیں دوسری طرف قلم بھی اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مصر نے سب سے پہلے اس میدان میں اپنا لوہا منوایا۔ جہاں دنیا کی اولین کتابوں کا سراغ پایا گیا۔ ماہرینِ آثارِ قدیمہ و لسانیات کے مطابق دی بک آف ڈڈ (مردے

کی کتاب) اولین کتابوں میں سے ایک ہے۔اس کتاب کا زمانہ کچھ حوالوں سے ۴۲۵۰ سال ق م اور کئی حوالوں سے تقریباً اڑھائی ہزار سال ق م متعین کیا گیا ہے۔ یہ پاپیرس رول پر لکھی گئی تھی جو ۹۰ فٹ لمبا تھا۔ جارج پٹنام نے اس کتاب کا تعارف کرواتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس میں دیوی دیوتاؤں، عبادتوں اور منتروں کا بیان ہے۔موت کے بعد دوسری دنیا کے لیے روح کے سفر کے لیے رُوداد درج کی گئی ہے۔جس میں گزشتہ زندگی کے اعمال کی تفصیل بھی ہے۔اور آخری فیصلے کا بیان بھی۔''[۱۹] اس کے ساتھ یہ آگاہی بھی دی گئی ہے کہ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام سے ۴۲۵۰ سال پہلے لکھی جانے والی اس کتاب سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ دور حضرت آدم کے قریب کا ہے۔ کیونکہ بائبل کے باب پیدائش کی رو سے جب ہم شخصیات کی عمروں کی جمع تفریق سے گزرتے ہیں۔تو حضرت آدمؑ کی پیدائش کا سال تقریباً ۵۵۱۷ قبل مسیح بنتا ہے۔[۲۰] یہ بات الگ ہے کہ ۴۲۵۰ + ۲۰۱۸ = ۶۲۶۸ سال پرانی کتاب محفوظ کیسے رہی۔اسے کیسے پڑھا گیا اور ترجمہ کیسے کیا گیا جب کہ موہن جوداڑو اور ہڑپہ سے برآمد ہونے والی تحریریں ابھی تک نہیں پڑھی جا سکیں۔لیکن ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ عبرت کے لیے اگر فرعون کی نعش کو محفوظ کر دیا گیا ہے تو یہ بھی کوئی بعید نہیں اور پھر ''اللہ رب العزت نے لوحِ محفوظ میں ہر چیز کو لکھ رکھا ہے۔''[۲۱] اس غیر متزلزل یقین کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کافی گنجائش نکل آتی ہے کہ وہی ہر چیز کو محفوظ رکھنے والی ذات ہے۔اور قلم کی اس لکھی تحریر کو، اگر یہ حقائق پر مبنی ہے تو ضرور محفوظ رکھا ہوگا۔

زمانوں کا اندازہ لگانا واقعی ایک مسئلہ ہے۔ کیونکہ بائبل میں لکھی ہوئی تاریخیں، کی جانے والی تبدیلیوں کے باعث درست نہیں سمجھی جا سکتیں۔ شاداں بریلوی نے قدیم حجری عہد ۱۰ ہزار سال قبل مسیح[۲۲] لکھا ہے۔اسی طرح فضل احمد جیبی نے حضرت آدم سے حضور ﷺ تک کا زمانہ ۱۲۰۰۰ سال پر محیط رقم کیا ہے۔[۲۳]

انسانوں کے بارے میں ڈارون کے نظریے کی بات اس لیے نہیں کروں گا کہ اللہ تعالیٰ نے تو ''انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا۔''[۲۴] اور ہم اس کو بندر کی ارتقائی شکل کہہ دیں۔ حضور ﷺ نے تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔جس کی تصدیق اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں کی کہ ''اللہ کی فطرت وہی ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا خدا کی بنائی ہوئی

چیزوں میں تغیّر وتبدل نہیں ہوسکتا۔''[۲۵] اور ہم اسے بندر کی نسل کہہ دیں انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرکے بندر تو بن سکتا ہے۔''[۲٦] لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ ڈارون کا مفروضہ درست مان لیا جائے۔

آئزک ایسی موف کا ۴۰ لاکھ سال قبل مسیح اور ۲۰ لاکھ سال قبل مسیح کا ہوموہیلیئس سے ہوموسیپین (موجودہ انسان) کا نظریہ [۲۷] بھی لایعنی ہے۔ کیونکہ یہ قرآن کے منافی ہے۔ قرآن نے ایسی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی۔

حضرت آدمؑ نے جب رحلت فرمائی تو حضرت نوحؑ کے والد کی عمر گیارہ برس تھی۔[۲۸] اس دور میں لوہے کو ڈھال کر ہتھیار بنانے کا عمل شروع ہو چکا تھا کیونکہ حضرت نوح علیہ السّلام نے جب کشتی بنائی تو اس میں کیل لگائے گئے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوہے کو ڈھالنا اور ان سے اپنی خواہش کے مطابق اوزار یا ہتھیار بنانا آسان ہو چکا تھا۔

حضرت نوحؑ ۳۸٦۲ ق م [۲۹] میں ہوئے۔ اگر چہ اس میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد ایک نئی تہذیب اور معاشرت کا آغاز ہوا۔ آپ کے تین بیٹے حام، سام اور یافت مختلف علاقوں میں آباد ہوئے۔ اور ان کی نسل اتنی پھیلی کہ کرۂ ارض پر چھا گئی۔ ضلع گجرات (پاکستان) کے ایک گاؤں بڑیلہ شریف میں ایک قبر ہے جس کی پائینتی کتبہ لگا ہے اور اس پر حضرت قنبیطؑ لکھا ہے۔ [۳۰] آپ حضرت آدمؑ کے بیٹے اور اللہ کے پیغمبر بتائے جاتے ہیں جو رشد و ہدایت کے لیے سرزمینِ پاک و ہند میں آئے۔ حضرت قنبیط کے مزار کی لمبائی ۷۰ گز یعنی ۲۱۰ فٹ ہے۔''[۳۱] لیکن ڈاکٹر احمد حسین احمد قریشی قلعداری نے اس صاحبِ قبر کا نام قنوطؑ لکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے ''ایہہ قبر حضرت آدمؑ دے پتر دی نہیں حضرت نوحؑ دے کسے پوترے دی قبر اے۔ حضرت نوحؑ، حضرت آدمؑ دے پچھوں ۱۴۴۴ ورہے بعد ہوئے نیں۔''[۳۲]

طوفانِ نوح کے بعد ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ حضرت نوحؑ کی نسل اس زمانے میں گروہوں کی صورت میں بٹ گئی۔ اور مختلف علاقوں میں اقامت اختیار کی۔ یافت اور اس کے بیٹے بحیرۂ اسود اور بحیرہ خزر کیسپیَن کے اردگرد مغرب میں ہسپانیہ تک پھیلے ہوئے علاقوں میں بودوباش کرنے لگے۔ حام کے تین بیٹے افریقہ میں جا بسے۔ بعد میں وہ شمال کی طرف سنعار اور اسور کے ممالک تک پھیل گئے۔۔۔ سم (سام) اور اس کی اولاد ان علاقوں پر قابض ہوگئی جو خلیج فارس کے شمال میں ہیں۔[۳۳]

حضرت نوحؑ کی اولاد سے تاریخ کا بھی ایک نیا سفر شروع ہوتا ہے یہ وہ عہد ہے جب کہ نہ تو کوئی باقاعدہ فوج تھی اور نہ ہی فوجی تربیت کا نظام تھا۔ لیکن حالات ویسے ہی تھے جن کی بنیاد قابیل نے رکھی تھی۔ خاص طور پر حام اور اس کی اولاد میں بہت زیادہ اختلاف پیدا ہوئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حام کی اولاد کو افریقہ چھوڑنا پڑا گویا اس عہد میں نسلِ آدم گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ آبادی چونکہ بڑھ گئی تھی۔ بستیاں آباد کر لی گئی تھیں، ہاتھاپائی اور زبانی عداوتوں سے نوبت لڑائیوں تک آ گئی تھی۔ تو اس صورت میں جب گروہ آپس میں ٹکراتے یا عدو کے مقابلے میں باہر نکلتے تو مردوں کی ساری آبادی میدانِ جنگ میں آ جاتی۔ اسی طرح جب وہ دوسرے علاقوں کو فتح کرنے کے لیے نکلتے تو سب مرد گروہ یا دستے میں شامل ہوتے۔ یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ مستقل فوجیں ترتیب نہ دے دی گئیں۔ چونکہ لوگ مختلف قبیلوں، قوموں اور گروہوں میں بٹ کر مختلف علاقوں پر قابض ہو کر زندگی کو نئے انداز سے گزارنے لگے تھے۔ سوچ اور فکر میں جدت پیدا ہوگئی تھی۔ نئے علاقوں کی تلاش شروع ہوگئی تھی۔ سو اِدھر اُدھر کے علاقوں سے ہندوستان کے خطہ میں بھی لوگ آ کر آباد ہوگئے۔

مؤرخین نے ان آبادکاروں کے حوالے سے کئی نظریات پیش کیے ہیں لیکن تین نظریے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۔ طوفانِ نوح کا نظریہ: اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ زمین پر آباد تمام لوگ آدمِ ثانی یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ تقریباً ۳۵۰۰ سال قبل مسیح اس خطے میں آبادی کا نشان تک نہ تھا۔ کیونکہ طوفانِ نوح میں تمام آبادیاں مٹ چکی تھیں لیکن دیکھنا پڑے گا کہ طوفانِ نوح کسی مخصوص علاقے میں تو نہیں آیا تھا اور باقی زمین اس طوفان یا اس کی تباہ کاری سے محفوظ رہی ہو۔ کیونکہ قدیم زمانوں میں ایک ایک وقت میں کئی رسولوں اور نبیوں کی آمد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور چونکہ صرف حضرت نوحؑ کے حالات ہم تک پہنچے ہیں یا ہم سمجھ پائے ہیں اس لیے دیگر حالات سے ہم انجان رہے۔ اور طوفان کی زد سے جو علاقے بچ گئے وہاں کی آبادیوں سے ہم ناواقف رہے۔ لیکن آثار کی جانکاری، تاریخ یا آثارِ قدیمہ کے مطالعہ سے یا گہرائی کے ساتھ غور و فکر سے سمجھنے میں ہمیں مدد ملتی ہے۔

۲۔ دراوڑ قوم کی فاتحانہ آمد: کچھ مؤرخین کا خیال ہے کہ "وادی سندھ میں آٹھ ہزار قبل مسیح میں

دراوڑ قوم فاتحین کی حیثیت سے داخل ہوئی۔ یہ قوم بحیرۂ روم کی طرف سے آئی۔ میسوپوٹیمیا، عراق، عرب اور بلوچستان سے ہوتی ہوئی سندھ میں داخل ہوئی۔'' [۳۴] اگر اس نظریے پر صاد کہتے ہیں تو بائبل میں تخلیقِ آدم کے حوالے سے دی گئی پوری بحث درست ثابت نہیں ہوتی۔ اور بابِ تکوین ر پیدائش میں نسلِ آدم کے ضمن میں دیے گئے تمام سنین بے کار ثابت ہوتے ہیں۔

۳۔افریقی اقوام کی ہندوستان آمد: شایاں بریلوی کے مطابق ۱۰ ہزار سال قبل مسیح [۳۵] اور محمد نعیم اللہ خیالی کے مطابق ۵ ہزار سال قبل مسیح زمانہ مابعد طوفانِ نوح حبشی Nigrito (اولاد حام بن نوح) سب سے پہلے ہندوستان میں باہر سے آنے والے لوگ تھے۔[۳٦] ''یہ افریقہ کے سمندری ساحلوں سے سفر کر کے جنوبی ہند پہنچے، جو رفتہ رفتہ شمال مشرقی ہند اور جنوبی بلوچستان وغیرہ کے علاقوں میں پھیلتے رہے۔'' [۳۷]

> ''ان تینوں نظریات میں سے سب سے زیادہ جس نظریہ کو پھیلایا اور تسلیم کیا گیا وہ یہ ہے کہ دراوڑ قوم برصغیر پاک و ہند کی قدیم ترین اقوام میں سے ہے۔'' [۳۸] ''جو متفقہ طور پر رائے تسلیم شدہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ پاک و ہند کے اصلی باشندے نہیں تھے۔ بلکہ آریائی اقوام کی طرح شمال مغربی دروں سے برصغیر میں داخل ہوئے۔اور سارے برصغیر پر چھا گئے۔'' [۳۹]

اگر تیسرے نظریے کو صحیح یا صحت کے قریب مانا جائے تو حبشی سب سے پہلے اس علاقے جسے ہندوستان کہا جاتا ہے کے آباد کار ہیں ان کے بعد ''روٹو سٹریر آئے جن کا تعلق فلسطین کے علاقے سے تھا۔'' [۴۰] روٹو سٹریر کے بارے میں یہ معلومات نہیں مل سکیں کہ آیا وہ فوجی دھانس دھاندلی سے داخل ہوئے تھے یا خالی علاقوں پر آ کر ڈیرے جما لیے ان کے بعد جس قوم کے ہندوستان میں وارد ہونے کا سراغ ملتا ہے۔ اور جو'' بحیرہ روم کی طرف سے آئے تھے انھیں پروٹو آسٹرا لائیڈ (Proto Austra Liad) یا آسٹرک کہا جاتا ہے۔ آسٹرک قبیلے شمالی اور وسطی ہندوستان میں آباد ہو گئے۔'' [۴۱] گویا یہ بھی فاتح نہیں تھے آباد کار تھے جو آئے اور بغیر کسی مزاحمت کے جہاں جگہ ملی مسکن بنا لیا۔ غالباً انہی قبائل کو خلیل صدیقی ایشیو آسٹرک قبائل یا کول یا منڈا قبائل کا نام دیتے ہیں جو شمالی ہند میں پنجاب تک آباد تھے۔[۴۲] نعیم اللہ خیالی نے انھیں کول، منڈا اور سنتھال وغیرہ لکھا ہے۔[۴۳] جب کہ عین الحق فرید کوٹی کا خیال ہے کہ ''منڈا قبائل کو قدیم آسٹریلوی

نسل سے منسلک قرار دیا جاتا ہے جو کہ ایک وقت میں نیوزی لینڈ سے لے کر پنجاب تک پھیلی ہوئی تھیں۔ برصغیر کا منڈا گروہ کول، بھیل، سنتھال، منڈا، ساورا، ہو، کوروا، چانگ، اور کورکو وغیرہ قبائل ہیں۔" [۴۴]

ہندوستان میں صرف یہی قبائل ہی ابتدائی آبادکار نہیں بلکہ مؤرخین کے نزدیک دراوڑوں سے پہلے چند اور قومیں بھی یہاں پہنچیں جن میں "سمیری عراق سے ترکِ وطن کر کے ۴۰۰۰ سال قبل مسیح میں درہ بولان کی راہ سے وادیٔ سندھ میں آئے اور اپنے ساتھ سمیری تہذیب لائے۔" [۴۵]

یہ ساری اقوام دراوڑوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہو چکی تھیں۔ اگرچہ قبائل اور اقوام اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر نقلِ مکانی کر رہی تھیں لیکن ابھی تک باقاعدہ کسی زبان کا پتہ نہیں چلتا۔ اسلامی حلقوں میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ جب تک آدم و حوا جنت میں تھے تو عربی ان کی زبان تھی لیکن جب زمین پر اتارے گئے تو ان کی زبان سریانی تھی۔ [۴۶] طوفانِ نوح کے بعد آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ زبانوں میں بھی دھرتی سے جڑت کی بنا پر اضافے ہونے لگے۔ اور کئی زبانیں وجود میں آنے لگیں۔ جن میں سے چند ایک زبانوں کے بارے میں ابتدائی ہونے کا دعویٰ ہے۔ [۴۷] زبان کے وجود میں آنے کے بارے میں بھی سائنس اور محققین نے اپنی الگ الگ رائے دی ہے۔ عطش درانی نے سات تصورات کا ذکر کیا ہے۔ جن کے باعث زبان وجود میں آئی۔

۱۔ ماما نظریہ (Mama Theory) آسان ہجا سے زبان کا آغاز۔
۲۔ بووو نظریہ (Bow wow Theory) کتے کی بولی یا آوازوں کی نقل اتارنے کا نظریہ
۳۔ پوپو نظریہ (Pooh pooh Theory) شدتِ جذبات کے باعث کچھ آوازیں منہ سے نکلتی ہیں۔
۴۔ ڈنگ ڈانگ نظریہ (Ding Dong Theory) لفظ و معانی کا ایک قسم کا باطنی تعلق۔
۵۔ یا ہے ہو نظریہ (Ya he ho Theory) محنت و مشکل حالت میں جو آوازیں نکلیں۔
۶۔ تا تا نظریہ (Ta Ta Theory) مل جل کر گانے بجانے سے جو لفظ بنتے ہیں۔
۷۔ ہے یو نظریہ (Hey You Theory) باہمی تفاعل اور تشخص سے جو لفظ بن گئے تو، میں، وہ وغیرہ۔" [۴۸]

عطش درانی کے نقل کیے گئے ان نظریات میں اختلافات موجود ہیں۔ خلیل صدیقی نے اپنے الفاظ میں زبان کے ارتقائی عمل کو مختلف حوالوں سے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس پر بات کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

- سقراط کی رائے تھی کہ دیوتاؤں نے دنیا کی اشیا کے موزوں نام رکھے۔
- دیومالا کی رو سے 'اوڈن' دیوتا نے زبان کی تخلیق کی۔
- قدیم ہند میں 'برہما' کو بھی زبان کا خالق سمجھا جاتا رہا۔
- یہودی عقیدے کی رو سے آدم نے خدا کی ہدایت کے بموجب اشیا کے نام مقرر کیے۔
- مسیحی یورپ میں صدیوں تک 'عہد نامہ عتیق' کی زبان عبرانی کو آسمانی زبان ہی نہیں بلکہ ام السنہ بھی سمجھا جاتا رہا۔[۴۹]

ان نکات کا اور اسلامی نقطۂ نظر کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تقریباً تمام مذاہب زبان کو تخلیقِ ربانی قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب مغربی دنیا میں مذہب کی جگہ مادہ نے لے لی اور عقل کو حقائق پر ترجیح دی جانے لگی تو پہلی بار جرمن مفکّر ہرڈر نے آغازِ زبان کے ربانی تخلیق ہونے کی تردید کی۔ حتیٰ کہ اس کے مضمون، زبان کا آغاز، (۱۷۷۲ء) کے بعد یہ نظریہ زور پکڑ گیا۔ لیکن ہم سارا الزام ہرڈر پر نہیں دے سکتے کیونکہ اس سے بہت پہلے ۹۳۰ء میں ابو ہاشم معتزلی نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ زبان انسان کی وضع کردہ ہے۔ اسی کو بنیاد بنا کر گیان چند نے زبان کے حوالے سے بحث کی ہے۔ اس کے نظریات کچھ اس طرح ہیں کہ:

۱۔ ہرڈر کا الوہی نظریہ سے اختلاف (بے ترتیبی اور بے قاعدگی کی بنا پر)
۲۔ قدیم زبانوں کا نظریہ (لہجوں کے مختلف ماحول میں پرورش پانے کے حوالے سے)
۳۔ فطری نظریہ (فیثا غورث چھٹی صدی قبل مسیح کا فطری اور باقدہ نظریہ)
۴۔ معاہدے کا نظریہ (انسانوں نے مل کر لہجے اور آوازوں کی بنا پر نام لکھے)
۵۔ حیوانی آوازوں کی نقل کا نظریہ (Bow-Wow Theory)
۶۔ اشیا کی جھنکار اور بصری پیکروں کی نقل کا نظریہ (Ding-Dong Theory)
۷۔ فجائی نظریہ (Pooh-Pooh Theory) (یہ میکس ملر کا تضحیکی نظریہ ہے۔

ہائے، واہ، آہ وغیرہ۔)

۸۔ اجتماعی محنت کی ہانک کا نظریہ (Yo-he-You) (ہانپتے کانپتے ہوئے جو آوازیں نکلتی ہیں)

۹۔ ٹاٹا نظریہ (محنت سے اعضائے نطق جسم کے ساتھ حرکت کرتے ہیں تو جو آواز نکلتی ہے یعنی ہوں، ہاں وغیرہ)

۱۰۔ اشارات و حرکات کا نظریہ (Gestures)

۱۱۔ ہنری سویٹ کا نظریہ (اشاروں اور اصوات کا ارتقائی نظریہ)

۱۲۔ نغماتی نظریہ (Sing Song Theory)

۱۳۔ ارتباطی نظریہ (Contact Theory) (بھوک، پیاس، جنسی خواہشات کی ترسیل وغیرہ)

۱۴۔ تاراپوروالے کا نظریہ (بچوں کی جبلی خواہشات اور اظہار سے اخذ کیا گیا) [۵۰]

جان جی جیکسن نے تو زبان کے ان نظریات اور کئی دیگر عوامل پر اپنی کتاب Man,God, and Civillization میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے بلکہ اپنے نظریات کو علاقائی حوالوں سے واضح کیا ہے۔ نیز اسی طرح کے کئی نظریات ماہرینِ لسانیات نے پیش کیے ہیں۔ جن میں کوئی حقیقت نہیں۔ ان نظریات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

"انسان نے جب جنم لیا تو اس کی کوئی اور زبان نہیں تھی۔ وہ بولتا ضرور تھا مگر ہوں، ہاں یا پھر چشم و ابرو کے اشارے ہی اس کی زبان تھی۔ ایک مدت تک وہ اس وسیلے سے زبان کی گاڑی کھینچتا رہا۔ انسانی معاشرہ جب منظم شکل میں سامنے آیا اور پھر یہ تنظیم مختلف قبیلوں کی صورت میں ڈھل گئی تو ان سب کو اپنے اپنے ماحول نے باہمی افہام و تفہیم کے لیے کچھ مبہم الفاظ سمجھائے جو بعد میں بامعنی لفظوں کی شکل میں مربوط ہو کر رفتہ رفتہ بہت بڑے ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ پہلے پہل بولی پھر نیم مکمل اور آخر میں مکمّل زبان بن گئی۔" [۵۱]

اس نظریہ کو سچ ثابت کرنے کے لیے The Jungle Book کا کردار مونگلی، ٹارزن کا کردار اور اکبرِ اعظم کا تجربہ جیسے کئی تجربات سامنے آئے۔ لیکن ایک روایت کہ "اللہ تعالیٰ نے

حضرت آدم کو سات لاکھ زبانیں سکھائیں۔ اور آپ کی اولاد میں یہی زبانیں رائج ہیں۔" [۵۲]
ان تجربات سے ہٹ کر سوچنے پر مجبور کرتی ہے اور پھر "خلق الا نسان ہ علمه البیان" [۵۳]
کی طرف توجہ مفروضوں سے انکار پر یقین کو پختہ کر دیتی ہے۔ اس انکار پر دوسری مُہر ان الفاظ سے
لگتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام علم سکھا کر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر
تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ ان سب نے کہا اے اللہ! تیری ذات پاک ہے، ہمیں تو صرف
اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھا دیا ہے۔ پورے علم و حکمت والا تو تُو ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم
سے فرمایا تم ان کے نام بتاؤ جب اس نے بتا دیے تو فرمایا کیا میں نے تمہیں پہلے ہی سے نہ کہا تھا
کہ زمین اور آسمان کا غیب میں ہی جانتا ہوں اور میرے علم میں ہے جو تم ظاہر کر رہے ہو اور جو تم
چھپاتے ہو۔ [۵۴]

یہ گفتگو جو اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور آدم کے درمیان عالمِ ارواح میں ہوئی اس بات کا
بین ثبوت ہے کہ کوئی زبان تو تھی جو اس گفتگو کا ذریعہ بنی۔

دراوڑیوں کی آمد سے پہلے اس خطۂ ارضی پر (جسے ہندو پاکستان کہتے ہیں) ایک راہ
ہموار ہو چکی تھی۔ تحریر کے حوالے سے بھی، ہتھیاروں کے حوالے سے بھی اور زبان کے حوالے سے
بھی۔ جو دلائل اوپر بیان کیے ہیں انھیں رد کر دینا اتنا آسان نہیں۔ بولنے اور لکھنے کے عمل دونوں
ہی زبان کے زمرے میں آتے ہیں۔ جب کہ ہتھیاروں کا بنانا اور ان کا استعمال فوجی نظام کا حصہ
ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ
کتاب اور ترازو تا کہ لوگ سیدھے رہیں اور انصاف پر، اور ہم نے اتارا لوہا، اس میں سخت لڑائی ہے
اور لوگوں کے کام چلتے ہیں۔ اور تا کہ معلوم کرے اللہ تعالیٰ کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے
رسولوں کی بِن دیکھے۔ بے شک اللہ زور آور ہے زبردست۔" [۵۵]

یہاں لوہے کو ایک ایسے روپ میں بیان کیا گیا ہے جس سے انصاف قائم رکھا جاتا ہے۔
ایک تاثر یہ بھی ہے کہ جو لوگ ہتھیاروں سے لیس ہو کر جنگوں میں حصہ لیتے ہیں ان کے فرائض میں
ملکی سرحدوں کی حفاظت کرنا شامل ہوتا ہے۔ اور وہ اس کے لیے ہر خطرے سے ٹکرا جانے کا عزم
رکھتے ہیں انہیں فوجی، عسکری، جیش یا آرمی کہا جاتا ہے۔ یوں عہدِ قدیم میں جب کہ باقاعدہ اور
منظم فوج نہیں ہوتی تھی جو شخص بھی ہتھیار اٹھا کر اس ہجوم کا حصہ بنتا تھا جو دفاع میں لڑتے یا دوسروں

کی حدود میں گھس کر انھیں مار بھگاتے، موت کے گھاٹ اتارتے یا غلام بنا لیتے وہ عسکری کہے جا سکتے ہیں۔

تاریخ برِصغیر میں ایسے لوگوں سے آگاہ کرتے ہوئے سب سے پہلے جن حملہ آوروں کی نشاندہی کرتی ہے وہ دراوڑی قوم ہے۔ دراوڑوں سے پہلے جو مختلف اقوام آتی رہیں وہ جہاں جگہ پاتیں سکونت اختیار کر لیتیں یا خانہ بدوشی میں زندگی بسر کرتی رہیں۔ جب میسوپوٹیمیا اور مصر میں قدیم تہذیبیں دریافت ہوئیں اس وقت دنیا کی بیشتر آبادی قبیلوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ''جب وہ جنگ پر جاتے تو کنبوں کے سربراہ ایک کونسل کی صورت میں اکٹھا ہوتے اور اپنا بادشاہ مقرر کرتے۔'' [۵۶] تب پورا قبیلہ لڑنے یا جنگ میں حصہ لینے والی فوج ہوتی اور بادشاہ اس فوج کا سپہ سالار۔ پھر سمیری تہذیب میں لازمی فوجی خدمت کو نافذ کیا گیا۔ مصر کے بعد غالباً یہ پہلا قدم تھا جو عسکری خدمات کے حوالے سے اٹھایا گیا۔ سمیریوں کے بعد وادیٔ دجلہ و فرات میں آشوریوں کی تہذیب نمایاں ہوئی۔ ان لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سخت جان اور جنگجو تھے۔ اس زمانے میں ''ریاست ایک عسکری چھاؤنی کی طرح تھی۔ فوج کے سالار امیر ترین اور طاقت ور ترین طبقہ کے لوگ ہوتے تھے۔'' [۵۷]

پروفیسر ڈورسی کے خیال کے مطابق سومیری ایلامی مہاجرین تھے۔۔۔ اگر وہ افغانستان میں آباد ہوتے تو انھیں افغانی کہا جاتا۔ شاید وہ قبل از تاریخ کے منگول تھے۔ [۵۸] اگر اسے درست مان لیا جائے تو سومیری ہی برِصغیر آنے کے بعد دراوڑی کہلائے ہوں گے اور چونکہ جنگجو تھے اور یہاں کے لوگ جنگی تہذیب اور معاشرت سے ابھی تک ناآشنا تھے لہٰذا سومیریوں نے بزورِ شمشیر ان علاقوں پر قبضہ کیا۔ اور یہاں کے قدیم باشندوں کو زیر کر کے اپنی طاقتور تہذیب کو اُجاگر کیا۔ لیکن ہال نے اس سے بالکل الگ کہانی بیان کی ہے۔ وہ سومیریوں کو وادیِ سندھ سے آئے ہوئے دراوڑی لکھتا ہے۔ اس کے مطابق سومیریوں کے مجسموں اور تصویری الواح سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔۔۔ کہ وہ بلا شبہ ہندوستانی نسل تھے اور مقبروں سے بھی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور یہ کسی بھی طرح خلافِ قیاس نہیں کہ سومیری ایک ہندوستانی نسل تھے۔ [۵۹]

ہال کے اس قیاس پر کسی ماہرِ لسانیات نے یقین کیا اور نہ ہی کسی عقل نے تسلیم کیا۔ دراوڑوں کے بارے مؤرخین نے اپنی رائے دی ہے سومیریوں کے علاوہ بلوچستان کے دروں

سے اقوام کی آمد، افریقہ کی اقوام سے ان کا تعلق نیز ''آریاؤں کی آمد سے پہلے وارد ہندوستان ہونے والی قوم کا ٹکراؤ پروٹو آسٹرالائیڈ نسل سے ہونے کے نتیجے میں دراوڑی نسل کا پیدا ہونا۔'' [۶۰] وغیرہ روایات تاریخ میں گردش کناں ہیں۔ منڈا اور دیگر قبائل جو برِصغیر میں آباد تھے۔ دراوڑیوں سے شکست کے بعد اپنی پہچان بھی گنوا بیٹھے۔ ترپاٹھی کا اس فاتح قوم کے بارے میں کہنا ہے کہ دراوڑ لوگ ہندوستان کی سب سے پرانی مہذب نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بدقسمتی سے ان کی اصل کا مسئلہ ایک معمہ بنا ہوا ہے اور اس کا قطعی حل تلاش نہیں کیا جا سکا۔ تاریخ کے متعدد عالموں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ دراوڑ لوگ ہندوستان کے قدیم ترین باشندوں کی اولاد تھے جو وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ سیڑھی پر سیڑھی چڑھتے گئے۔ [۶۱] اس کے خلاف دیگر ماہرین یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ لوگ تبت کے پلیٹو یا وسط ایشیا میں اپنے وطن مالوف توران سے آ کر یہاں بس گئے تھے۔ بہر حال مغربی ایشیا کو عام طور پر ان کا مسکن خیال کیا جاتا ہے۔ دراوڑ اور سمیری لوگوں میں جو نسلی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ وہ اس خیال کو تقویت پہنچاتی ہے۔ صاحبزادہ محمد عبدالرسول بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں اور پائے جانے والے اختلاف کے قائل ہیں۔ [۶۲] ڈاکٹر مسکین حجازی نے محققین کی اسی رائے کا ہی اظہار کیا ہے کہ ''یہ آبادیاں بسانے والے سات، آٹھ ہزار سال قبل عراق عرب سے آئے تھے اور دراوڑی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔'' [۶۳] لیکن سر ولیم ہنٹر کے مطابق ساحل ملیبار پر نائر قوم بھی کسی اگلی ہی قوم کی نشانی ہے اور ان میں شادی بیاہ کا وہی رواج ابھی تک جاری ہے جو ہزار ہا سال پیشتر تھا۔ ایک عورت کئی کئی مرد کر سکتی ہے لیکن مرد کو اجازت نہیں کہ ایک عورت کے سوا دوسری شادی کر سکے۔ محمود خان محمود اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ ماہرینِ علم الانسان نے نتیجہ نکالا کہ جنوبی ہندوستان کی یہ قدیم قومیں یا تو یہاں اُس زمانے سے آباد ہیں جب سے دنیا آباد ہوئی یا اُس زمانے میں جب لیموریا، افریقہ اور ایشیا مل کر ایک ہی براعظم تھا، افریقہ سے نقل مکانی کر کے یہاں آئی تھیں۔ [۶۴]

۲۔ اُردو زبان کا نقطۂ آغاز

بہر حال یہ مسئلہ جتنا بھی الجھا ہوا ہو اس بات پر تمام محققین متفق ہیں کہ اس قوم سے ایک نئی تہذیب نے جنم لیا یہیں سے ایک نئی زبان کی بنیاد پڑی جسے دراوڑی زبان کا نام دیا گیا۔

اس سے قبل اس خطے میں آباد اقوام میں بولی جانے والی زبانوں کے حوالے سے معلومات مفقود ہیں۔ ''ان کی زبان کے بارے میں تاریخِ لسانیات خاموش ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق ان کی زبان کے دو الفاظ چمپانزی اور جُوجُو آج بھی اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں مستعمل ہیں۔''[۶۵] علاوہ ان دو الفاظ کے ''اردو زبان کے دو عام فہم الفاظ آگ اور پانی بھی دراوڑی عہد سے پہلے کے ہیں۔ یہ دونوں الفاظ انہی معنوں میں اگن اور پانیم کی صورت میں سنسکرت میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔''[۶۶] اسی طرح ''گنگا کی اصلیتؒ آسٹرک زبان بتائی جاتی ہے۔ جو کیانگ ہے اور اس کے معنی بھی پانی ہیں۔''[۶۷] ان کے علاوہ نیرک بمعنی نرخ او کتے بمعنی اوقات، کھو بمعنی کھانسنا، لاہی بمعنی لاکھ سنتالی زبان کے الفاظ ہیں۔''[۶۸] کچھ الفاظ گریرسن نے بھی لکھے ہیں جو منڈا قبائل کے سنسکرت کی کتابوں میں ملتے ہیں اور آج بھی مستعمل ہیں۔ جیسے ''کپاس، کپاس کا کپڑا، بانس کے تیر (سار) یا پھر بعض جغرافیائی نام جیسے کوشل، تسلا، کالنگا وغیرہ گنتی میں بیس کی اکائی، کوڑی کا استعمال بھی منڈا قبائل سے مستعار ہے۔''[۶۹]

دراوڑوں کی یہ پہلی عسکری کاروائی ان کی کامیابی کے بعد ہندوستان میں مستقل قیام کا سبب کہی جاسکتی ہے۔ یہاں انھوں نے بستیاں آباد کیں۔ کھیتی باڑی کو اپنایا۔ ''یہاں کی آب وہوا نے ان کو تعیّش پسند بنا دیا۔ جس کا اندازہ ہڑپہ، موہن جودڑو، آمری (نزد موہن جودڑو)، نال (بلوچستان)، روپڑ، راجستھان میں کالی بنگن اور گجرات میں لوتھل کے مقامات سے برآمد ہونے والے آثار ہیں۔''[۷۰]

دراوڑیوں کی ہندوستان کے خطہ میں آمد یا ان کے جنم کا عرصہ بھی متعین نہیں کیا جاسکتا۔ مؤرخین نے اپنی اپنی دانست کے مطابق ۵ ہزار سال قبل مسیح سے ۳ ہزار سال قبل مسیح کا زمانہ لکھا ہے لیکن تاریخ ترتیب اور اکثر مشابہات سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ ''موہن جودڑو کا زمانہ ۳۳۰۰ سال قبل مسیح اور نام نہاد دراوڑیوں کا زمانہ ۳۰۰۰ سال قبل مسیح رہا ہوگا۔''[۷۱] دراوڑی عہد کو نان آرین مہاجرین کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ جب سندھ اور پنجاب میں دراوڑ عساکر فاتحانہ داخل ہوئیں۔ تو انہیں دنوں ''شمال مشرق سے ہمالہ کی برفستانی چوٹیاں پھاندتے ہوئے تبتو برمن بھی ہندوستان میں آئے۔ ان کے فوراً بعد کولاریئین بھی اسی راستہ سے بنگالہ میں آکودے۔ اور پھر دکن کی طرف اتر آئے۔''[۷۲] یہ لوگ تبّتی، پہاڑی، کولاری، تاتاری بولتے تھے۔ لیکن یہاں آ

کران کے اطوار وتہذیب کی طرح وہ زبانیں بھی بدلیں اور صاف ہوئیں۔[۷۳] اب خطۂ ہند میں مشرق اور مغرب میں بولی جانے والی زبانیں اپنے اپنے اثرات کے باعث تبدیل ہوئیں۔ شمال مشرق سے آنے والے لوگوں کے بارے میں معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ بھی کسی لڑائی کے بعد فاتحانہ داخل ہوئے تھے یا خطۂ زمین کو خالی پا کر آباد ہو گئے۔

وادیٔ سندھ یعنی دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کی اس سرزمین کی یہ تہذیب جسے دراوڑ تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ داخل تو ہتھیاروں کے زور اور فوجی نظم (جو اس وقت تھا) سے ہوئی تھی لیکن اس سرزمین پر آکر اپنی بہادری اور دلیری بھول گئی۔ اس کا اندازہ موہن جودڑو اور ہڑپہ کی کھدائی کے دوران ملنے والے عسکری آلات سے ہوا کیونکہ ''آلاتِ جنگ بہت کم مقدار میں برآمد ہوئے۔ ان کے اسلحہ میں تانبے اور کانسی کے بنے ہوئے تیر، کمان، خنجر اور کلہاڑے ملے ہیں۔ ڈھال، تلوار اور زرہ بکتر کا استعمال شاید اس وقت وادیٔ سندھ میں نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ امن پسند اور متمدن تھے اور انھوں نے فنونِ جنگ میں ترقی نہیں کی تھی۔''[۷۴] زبان کے مطالعے سے یہ حقیقت تو واضح ہوجاتی ہے کہ دراوڑیوں سے پہلے کی آباد اقوام نے جس زبان کا بیج بویا تھا وہ اس دھرتی کی اپنی زبان تھی جس میں دراوڑیوں کے حملے کے باعث تبدیلی آنا شروع ہوئی اور دراوڑیوں کی عسکری قوت اس نئی زبان جسے آج ہم اردو کہتے ہیں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ ہر شخص اس بات کا معترف ہے کہ ''قاعدہ کی رو سے مفتوح قوم، فاتح قوم کی زبان، مذہب، تہذیب و تمدن، آدابِ معیشت و معاشرت اور رسم و رواج قبول کرتی رہتی ہے۔''[۷۵] بقول ولیم ولیمس ''حاکم قوم کی تہذیب محکوم قوم کا مذہب ہے۔''[۷۶] اس کلیہ کے مطابق دراوڑ مکمل طور پر ہندوستان کی تہذیب و ثقافت پر چھا گئے۔ یہاں تک کہ قدیم تہذیب کو تاریخ سے نکلنا پڑا اور مؤرخین نے جب تاریخ لکھی تو اکثر مؤرخین کے ہاں دراوڑی تہذیب ہی ہندوستان کی پہلی تہذیب اور دراوڑی زبان ہی پہلی زبان قرار پائی۔ اور جب اردو زبان کی بات ہوئی تو بھی یہی نکتہ سامنے آیا کہ اردو کی کہانی اتنی ہی قدیم ہے جتنی دراوڑی تہذیب۔''[۷۷] گویا ماہرینِ لسانیات اس سے آگے سوچنے کی زحمت سے بچ گئے اور اسے ہی حرفِ آخر سمجھ لیا کہ واقعی اور بس۔ بلکہ اگر کچھ ماہرینِ لسانیات دراوڑیوں سے بعد میں آنے والی قوموں کا جب جائزہ لیتے ہیں تو پھر بھی دراوڑی زبان ہی سامنے آتی ہے۔ چونکہ یہ تسلّط عسکری تھا لہٰذا اردو زبان کی بنیادوں میں سے عسکری نقطۂ نظر

گویا عسکری اہلِ قلم کی خدمات کو ہم ابتدائی دور میں بھی کسی صورت منہا نہیں کر سکتے۔ اگرچہ کسی ایسے شخص کا نام سامنے نہیں آیا لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ کوئی غیر عسکری شخص بھی تو ابتدائے زبان یا ابتدائی زمانے میں تاریخ کا حصہ اس حوالے سے نہیں بنا۔" اس کے دوسرے پہلو کو لیں تو دراوڑیوں کی زبان کے اثرات اور بہت سے الفاظ آج بھی مستعمل ہیں۔"[۷۸] دراوڑوں کی اصل جو کچھ بھی ہو یہ یقینی ہے کہ دراوڑ ہندوستان کی آبادی کا اہم عنصر تھے شمالی ہند میں بھی اور جنوبی ہند میں بھی۔ ماہرینِ لسانیات اس بات پر بھی متفق ہیں کہ براہوی زبان دراوڑی زبان کا ارتقائی روپ ہے۔ "جہاں تک زبان کا تعلق ہے محققین نے دراویدی زبانوں کے بعض عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ نیز ان زبانوں کا آریائی زبان کے قواعد اور صوتیات پر کافی اثر پڑا۔"[۷۹] یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ "کسی بھی زبان کی بنیاد کوئی باہر کی زبان نہیں ہو سکتی۔ جو زبان جس ملک میں پیدا ہوئی۔ اس کی بنیاد اس ملک کی کوئی زبان اور مقامی بولیاں ہو سکتی ہیں۔ چونکہ اردو کا مولد و منشا برِعظیم پاک و ہند ہے۔"[۸۰] اس لیے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اس دھرتی کی قدیم زبانیں ہی اردو کی بنیاد ہیں۔ بعد میں آنے والی زبانیں اس زبان میں ارتقائی عمل کو جاری رکھنے کا سبب تو بنیں لیکن اسے مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔

۳۔ اُردو زبان کا سفر

دراوڑیوں کی عسکری آمد لیکن بعد ازاں تہذیب و تمدن اور ترقی نے اس خطہ کو سونے کی چڑیا بنا دیا۔ وہ امن سے رہنے لگے۔ حضرت سلیمانؑ کو جب ہیکل کی تعمیر کے لیے سامان کی ضرورت تھی تو آپ نے مختلف علاقوں پر سامان کے حصول کے لئے چڑھائی کی۔ عہد نامہ عتیق میں منقول ہے کہ "پھر سلیمان سمندر کے ساحل پر ادوم کے ملک میں عصیون جابر اور ایلہ کو گیا۔ اور حیرام نے اسے وہ جہاز بھیج کر اس کا تعاون کیا جن پر اس کے بحری تجربہ کار خادم ملاح تھے اور وہ سلیمان کے خادموں کے ساتھ اوفیر کو گئے اور وہاں سے انہوں نے چار سو پچاس قنطار سونا لیا اور اس کو سلیمان بادشاہ کے پاس لائے۔"[۸۱]

محمود خان محمود نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے دو بحری مہمیں بھیجی تھیں ان کا مقصد یہ تھا کہ بندرگاہ ترسیس اور اوفیر سے سونا، چاندی، ہاتھی دانت، بندر، صندل اور مور لائیں۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ جغرافیہ دان اس پر متفق ہیں کہ ترسیس جنوبی ہند کا ایک

بندرگاہ تھا جواب ناپید ہو گیا ہے۔ صندل اور مور جنوبی ہند کی سوغاتیں ہیں۔[۸۲] جبکہ جیکب سموئیل شنوانے اس کی تردید کی ہے۔ وہ ترسیس کی معنوی وضاحت کرتا ہے اور اس ضمن میں لکھتا ہے کہ لفظ ترسیس کا مطلب ''دھات صاف کرنے کی جگہ، ہوسکتا ہے۔ چونکہ بحیرہ روم کے علاقہ کی تجارت پر فینیکیوں کا کنٹرول تھا اس لیے سلیمان کی بحری سرگرمیاں بحیرۂ قلزم تک محدود تھیں۔ 'ترسیس' بیڑے سے مراد ہے کہ یہ عصیون جابر میں 'دھات کرنے کے مرکز' سے سفر کرتے تھے۔[۸۳]

آریہ جو آپس میں خاندانی جھگڑوں اور چراگاہوں میں کمی کے باعث اپنے علاقوں سے نکلے اور برصغیر کا رخ کیا۔[۸۴] آریہ گھڑسوار اور تلوار چلانے کے ماہر تھے۔ انھوں نے تلوار کے زور پر دراوڑوں سے سب کچھ چھین لیا۔[۸۵] یہ لوگ ۳۵۰۰ ق م سے ۸۰۰ قبل مسیح تک مختلف گروہوں کی صورت میں آتے رہے۔ اور مختلف علاقوں پر قابض ہوتے رہے۔ مفتی شوکت علی فہمی کے مطابق آریوں نے دراوڑوں سے چھینے ہوئے علاقوں پر پانچ حکومتیں قائم کیں۔[۸۶] گویا آریہ جو گروہوں کی شکل میں آتے رہے۔ وہ باقاعدہ کسی سردار کی سربراہی میں حملہ آور ہوتے۔ برِصغیر میں ان فاتحین نے جہاں ایک باقاعدہ فوجی نظام کا ڈھانچا ترتیب دیا وہیں یہ لوگ اپنے سے زیادہ تعداد میں پہلے سے موجود لوگوں میں گھل مل گئے۔ انھوں نے دراوڑی قبائل میں شادیاں کیں۔ یہاں کی تہذیب کو تبدیل کیا اور خود ان میں آہستہ آہستہ جذب ہو کر اس کا حصہ بن گئے لیکن اکثریت میں ہونے کی وجہ سے دراوڑیوں نے آریائی تمدن، مذہب اور زبان پر گہرا اثر ڈالا۔ یہاں ہم اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ دراوڑ مہذب تھے۔ جب کہ ان کی نسبت آرین خانہ بدوش، غیر مہذب اور وحشی گردانے جاتے تھے۔ دراوڑوں کا یہ اثر بھی ہوا کہ آرین تہذیب کے دائرے میں آنے لگے۔ ''آریوں نے دراوڑی قوموں سے لکھنا پڑھنا سیکھا۔''[۸۷] فاتحین اور مفتوحین کے اس ملاپ اور اختلاط سے معاشرت میں تبدیلی کے ساتھ زبان میں بھی تبدیلی آئی۔ آرین چونکہ مختلف اوقات اور مختلف علاقوں سے آئے تھے ان سپاہیوں کی اپنی اپنی زبان تھی۔ خطۂ ہندو پاک کے لوگ بھی مختلف علاقوں میں زبان کی کچھ کچھ تبدیلی کے حامل تھے۔ لہٰذا مختلف علاقوں میں جہاں زبان میں خوبصورتی اور روانی آئی وہیں مختلف ادوار میں بھی اس میں تبدیلی رونما ہوئی۔ یہی وہ عہد ہے جب وید تحریر ہوئے۔ رگ وید، یجر وید، اتھر وید اور سام وید' روایات میں اختلاف کے باوجود آٹھ سو سال قبل مسیح تک تحریر ہو چکے تھے۔ آریہ جب برِصغیر میں داخل ہوئے۔

تو ''ان حملہ آوروں کو کچھ بھجن اور گیت زبانی یاد تھے۔'' [۸۸] یہ عسکری جو قبائل کی صورت میں بٹ گئے تھے ان قبیلوں کے نام بھی رگ وید میں ملتے ہیں۔ [۸۹] ویدک سنسکرت میں بولیوں کے تین روپ ملتے ہیں۔ قدیم ترین روپ اس وقت کا ہے جب آریہ محض پنجاب تک پہنچے تھے۔ اسے شمالی بولی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد وسطی بولی ہے۔ یعنی جب آریہ مدھیہ دیش تک جا بسے تھے۔۔۔ آخری منزل مشرقی بولی، یہ آٹھویں نویں صدی قبل مسیح تک ہو سکتی ہے۔ اس وقت تک آریہ مشرقی ہند تک پہنچ چکے تھے۔ [۹۰]

آریاؤں کی فوجی تنظیم میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں وہ یہ کہ آریا جب ہندوستان میں آباد ہوئے۔ تو ان کی جماعت قبیلوں پر مشتمل تھی۔ جن کی ملکیت الگ الگ زمینیں تھیں۔ یہ تمام لوگ اپنے اپنے قبیلے کی طرف سے عسکری حصے تھے۔ عام طور پر قبیلہ میں ایک راجا ہوتا تھا۔ اور چند ممتاز خاندان جن کا منصب راجا کے ماتحت حکومت کا کام کرنا تھا۔ میدانِ جنگ میں فوج کی سرداری راجہ اور انہی چند خاندانوں کے لوگ کرتے تھے۔ [۹۱] صاحبزادہ عبدالرسول اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

> ''آریائی خاندان متفقہ طور پر اپنے قدیم سردار یا اس کے بڑے لڑکے کے ماتحت رہتے تھے۔ اس طرح بادشاہت کا آغاز ہوا قبیلہ کے متفقہ سردار کو راجن کہتے تھے۔ راجن کا عہدہ بالعموم موروثی ہوتا تھا۔ لیکن بعض اوقات راجن کا انتخاب بھی عمل میں آتا تھا۔ آریہ ہمیشہ باہمی جنگ و جدال یا غیر آریائی اقوام کے ساتھ نبرد آزمائی میں مصروف رہتے تھے۔ اس لیے مشترکہ دفاع کے پیشِ نظر بادشاہت کا آغاز ہوا۔ راجن کا سب سے اہم فرض قبیلہ کا دفاع تھا۔ زمانۂ جنگ میں وہ فوج کی سپہ سالاری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ دیہات کو دس دس، بیس بیس، سو سو، ہزار ہزار کے گروہوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر گروہ کا سردار اپنے اوپر کے سردار کے ماتحت تھا۔'' [۹۲]

وید جب لکھے گئے تو آج تک یہ علم نہیں ہو سکا کہ یہ کس نے لکھے۔ البتہ ہندو اسے ایشور کی بنائی ہوئی کتاب تسلیم کرتے ہیں اور وہ انھیں ایشور سے ظاہر یا پیدا ہونا قرار دیتے ہیں۔ ایک سوال کہ ''انسان سے کیا یہ ممکن ہے'' کا جواب دیتے ہوئے سوامی دیانند سرسوتی لکھتے ہیں کہ:

''ایشور کے بنائے ہوئے ویدوں کو پڑھنے کے بعد کسی شخص کو کتاب بنانے کی طاقت ہوسکتی ہے نہ کہ اس سے برعکس۔ پڑھنے اور سننے کے بغیر کوئی انسان بھی عالم نہیں بن سکتا۔ مثلاً دیکھا جاتا ہے کہ کچھ نہ کچھ شاستر (علمی کتاب) پڑھ کر اپدیش (تقریر) سن کر اور کاروبارِ عالم کا مشاہدہ کر کے انسان کو علم اور گیان (عرفان) حاصل ہوتا ہے۔ جنگلی (یا وحشی) آدمیوں کو اگر تعلیم نہ دی جائے تو حیوان کی مانند ہوتے ہیں۔ پس ابتدائے آفرینش سے آج تک اگر ویدوں کی تعلیم نہ ہوتی تو کل انسانوں کی یہی حالت ہوتی۔ پھر کتاب بنانے کا تو ذکر ہی کیا۔''[۹۳]

یہ منطق ان کی اپنی ہے کس طرح سے انھوں نے ثابت کیا وہی جانیں گویا ان کا کہنا ہے کہ وید الہامی کتابیں ہیں جو انسانوں کی محررہ نہیں ہیں۔ رگ وید میں جو قبیلے دیے گئے ہیں ان میں سے ایک کا نام بھرت تھا۔ جس کے نام پر بھارت ہوا۔ آریوں اور دراوڑوں کے اختلاط سے بننے والی زبان کا غالباً کوئی نام نہیں تھا۔ اسے آرین ہی کہا جاتا تھا۔ لیکن جب زبان برہمنوں کے ہتھے چڑھی تو انھوں نے مفتوحین کی زبان سے اپنی زبان بلند رکھنے کی سوچ کے تحت اس کے کچھ قواعد و اصول ترتیب دیے اور اپنی زبان کا نام سنسکرت رکھا۔[۹۴] اس زبان پر عوامی زبان نے غلبہ پالیا کیونکہ سنسکرت محدود ہو کر رہ گئی تھی اور عوام کو یہ زبان بولنے کی بھی آخر اجازت نہیں رہی۔ یوں اس زبان کی پوترتا اس کے فروغ میں رکاوٹ بن گئی۔ سنسکرت میں چاروں وید، بعدازاں مہابھارت، رامائن، بھگوت وغیرہ لکھی گئیں۔ جن میں سے بظاہر کسی عسکری اہلِ قلم کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن رزمیہ ادب کی ابتدا انہی سے ہوئی۔ رزمیہ ادب جسے سنسکرت میں مہا کاویہ کہا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ویدوں سے ابتدا ہوئی اور پھر ہمیں مہابھارت، رامائن اور بھگوت میں عسکری شخصیات سے متعلق آگاہی ملتی ہے۔ لیکن عسکری اہلِ قلم کے اسماء کا کہیں ذکر نہیں۔ ''رزمیہ ادب کا باضابطہ آغاز رامائن اور مہابھارت سے ہوتا ہے گویا یہ دونوں تخلیقات رزمیہ ادب کا سرچشمہ ہیں۔''[۹۵] جس اسلوب میں جنگوں کی کہانیاں، داستانیں یا روداد یں ہندومت کی ان کتب میں تحریر ہوئی ہیں۔ ان سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ لکھاری کسی نہ کسی صورت میں جنگوں کا حصہ رہے ہوں گے۔ کروکیشتر کی عظیم جنگ ۔۔۔ عظیم ترین نظم مہابھارت کی بنیاد بنی۔ روایت کے مطابق اس جنگ میں پورا

ہندوستان سندھ سے لے کر آسام تک اور ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک شامل تھا۔ مہابھارت کی یہ جنگ تین ہزار ایک سو دو قبل مسیح میں ہوئی۔[۹۶] رامائن میں زیادہ تر احوال رام سے متعلق ہیں جو راجہ دشرتھ کا بیٹا تھا۔ اس میں رام کو قابلِ اعتماد اور فرض شناس بیٹا، شفیق بھائی، محبت کرنے والا خاوند، سخت گیر اور سنگ دل جنگ جو اور مثالی بادشاہ نیز آریائی زندگی کے اعلیٰ تصورات کی تجسیم ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔[۹۷] رامائن اور مہابھارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف دریاؤں کے کنارے خودمختار آریا راجاؤں کی ریاستیں قائم تھیں اور یہ آپس میں اکثر برسرِ پیکار بھی رہتی تھیں۔ آبادی کے تمام مردان جنگوں میں حصہ لیتے تھے۔ چونکہ تمام افراد ہی سپاہی ہوتے تھے اس لیے ان میں لکھنے والوں یعنی اہل قلم کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

آریائی دراصل کوئی نسلی اصطلاح نہ تھی، نہ ہی وہ لوگ کسی ایک خاص گروہ سے نسبت ظاہر کرنے کے لیے اپنے آپ کو آریائی کہتے تھے۔ ''بلکہ آریا ان کے لیے ایک کلمۂ تفاخر تھا جو خاندانی یا معتبر یا معزز کے معنی میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ جب مشترکہ رہن سہن کے حامل متعدد قبائل کے ایک نیم مربوط سلسلے میں ڈھلے تو ایک ایسی زبان استعمال کرنے لگے جو آئندہ ادوار میں کئی ایک ایشیائی اور یورپی زبانوں اور بولیوں کی بنیاد بنی۔ اسی نسبت سے انھیں ہند یوروپی بھی کہا جاتا ہے۔''[۹۸] فرہنگِ آصفیہ کے مطابق:

> ''سنِ عیسوی سے گیارہ یا بارہ سو برس پیشتر منوچہر کے زمانے میں سام، نریمان، رستم ستان کا ہند میں آنا، اور سورج رائے والیٔ قنوج کا رستم کے ساتھ اپنی بھانجی کا بیاہ دینا اور اس امر سے اس کا خوش ہو کر اپنے ملک ایران کا رستہ لینا۔ بعدازاں افراسیاب کا اول مرتبہ پچاس ہزار ترکوں کا یہاں بھیجنا اور اخیر کو خود ایک لاکھ سوار لے کر چڑھ آنا۔ نیز سنِ عیسوی سے ۹ سو برس پہلے کیکاؤس کا اکثر اقطاعِ ہند پر قابض رہنا تاریخوں سے بخوبی ثابت ہے۔
>
> اصل میں یہی زمانہ زبانِ اردو کی بنیاد پڑنے کا پورا پورا زمانہ ہے۔''[۹۹]

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ زبانِ اردو کے لیے زمین تو سنِ عیسوی سے قبل ہی تیار ہو چکی تھی۔ آٹھویں نویں صدی قبل مسیح میں ہی ساکا قبیلے کی آمد کا پتہ چلتا ہے۔ وہ بھی آریوں ہی کی مشرقی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر ان کی تہذیب ویدک آریوں سے مختلف

تھی۔مہابھارت دراصل ساکاؤں اور آریاؤں کے درمیان اقتدار کی جنگ کی داستان ہے۔انھوں نے کوروؤں اور پنچالوں کی جنگ میں پنچالوں کی مدد کی اور لڑائی جیتنے کے بعد ٹیکسلا میں راج کرنے لگے۔[۱۰۰] روایت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وید مکمل ہو چکے تھے لیکن ہندو مذہب کی دیگر کتب ابھی منظرِ عام پر نہیں آئی تھیں کہ ''۵۰۷ق م میں ایران کے فرمانروا فریدون نے ہندوستان پر حملہ کیا۔اور پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔''[۱۰۱] اس زمانے تک مشرق و مغرب اور شمال سے کئی اقوام فاتحانہ ہندوستان میں داخل ہو چکی تھیں۔انہیں عسا کرنے اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت کے اثرات یہاں کی مقامی تہذیب وثقافت اور زبان میں داخل کر دیے تھے۔۶۰۶ قبل مسیح سے پہلے کیخسرو بادشاہِ فارس جو بخت نصر، بادشاہِ بابل کا ہم عصر تھا اس کی حکمرانی باسفورس سے دریائے سندھ تک تھی، لہٰذا مؤرّخین نے لکھا ہے کہ شاہِ فارس کے لشکر میں جو ایران و توران کے سپاہی تھے ان کی زبان سے ہندوستان کے اس علاقے میں بسنے والے لوگوں کی زبان بہت متاثر ہوئی۔یوں فارسی آمیز زبان شمالی ہند میں اُسی وقت سے جڑ پکڑ گئی، سو آج تک پنجاب و سندھ میں فارسی الفاظ دیگر زبانوں کے الفاظ کی نسبت زیادہ پائے جاتے ہیں۔

سائرس (۵۳۰۔۵۵۸ق م تقریباً) کی فوجیں ایک بار پھر ہندوستان میں داخل ہوئیں۔ سائرس کے بعد اس کے پوتے دارا نے ۵۱۵ اور ۵۱۸ قبل مسیح کے درمیان حملہ کر کے وادیٔ سندھ کے بڑے حصے یعنی دریائے سندھ کے مغربی کنارے تک کے علاقے کو فتح کرلیا۔بعد ازاں اس نے پنجاب کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔[۱۰۲] وہ زرتشتی مذہب کا پیرو تھا۔ایران کے ان عسکری حملوں میں ایران کے عسکری دانشوروں نے ہتھیار اور زبان دونوں سے کام لیا۔سید احمد دہلوی کے مطابق دارا اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ جب میں ہند میں آیا تو میں نے دو طرح کے آدمی اور دو ہی طرح کی زبانیں پائیں۔جو کالے کالے قوّی ہیکل مثل دیو آدمی تھے اُن کی بولی مطلق میری سمجھ میں نہ آتی تھی اور جو گورے گورے چھریرے جسم والے تھے اُن کی بہت سی باتیں میں سمجھ لیتا تھا۔ چنانچہ اسی وجہ سے وہ یہاں کہ کچھ آدمی اپنے ساتھ لے گیا جو غالباً وہی آریا قوم کے لوگ ہوں گے جن کے الفاظ اُس کی سمجھ میں آتے تھے۔مگر جو سیاہ فام تھے وہ اصلی باشندے یعنی دراوڑ نسل کے آدمی ہوں گے۔[۱۰۳] ہتھیار سے تو علاقے فتح ہوئے۔اور زبان سے دل۔دلوں کی فتح کے اثرات آج بھی دکھائی دیتے ہیں کہ اشوک نے جب تخت بائی کو اپنا دار الحکومت بنایا اور بدھ مت

اختیار کیا تو پورے ہندوستان میں ۱۴ چٹانوں پر احکامات کندہ کرائے۔ جس کے آثار پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخواہ کے شہر شہباز گڑھی ضلع صوابی میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ تحریر ایرانیوں کی اس وقت کی زبان ہخامنشی کی طرح دائیں سے شروع ہوتی ہے جب کہ ہندی سنسکرت بائیں طرف سے لکھی جاتی ہے۔[۱۰۴] دارا کے اس حملے نے جو تہذیبی اثرات چھوڑے وہ اپنی جگہ، لسانی اثرات میں نہ صرف خروشتی انداز کو اپنایا گیا بلکہ آرامی اور خروشتی رسم الخط کی ابتدا بھی ہوئی اور معاشرے میں عسکری پیشہ رکھنے والے افراد کو اول جب کہ زراعت پیشہ، صنعت کاروں اور تاجروں کو دوسرا مقام حاصل ہوا۔[۱۰۵] تقریباً ۴۰۰ قبل مسیح میں ایران کے ہی زردشتی بادشاہ گستاسپ نے شمال مغربی ہند پر حملہ کر کے اسے بھی اپنے تسلّط میں کر لیا۔[۱۰۶]

ہندوستان پر ایرانیوں کے پے در پے حملوں اور فوجیوں کے اثر ورسوخ سے اس خطہ میں بولی جانے والی زبانوں میں ہخامنشی، ژند اور پارسی زبان کے الفاظ نے شامل ہو کر اس کی ہیئت اور لب ولہجہ کو ایک حد تک تبدیل کر دیا۔ چونکہ دارا اور گستاسپ کے درمیانی عہد میں ہندوستان کی اس سرزمین کے اندر بھی ایک تبدیلی آئی۔ جس نے سنسکرت کو تقریباً تقریباً عوام سے دور کر دیا۔ یہ تھی بدھ مت کی تحریک۔ اگرچہ یہ تحریک خالص مذہبی تھی اور اس کے عسکری مقاصد نہیں تھے۔ لیکن بعد میں اسے فروغ دینے میں کاشی اور کوشل کی راجدھانی سے لے کر کمبوج خاندان اور گندھار کی حکومت تک اس کا حصہ بنے۔ بدھ سے پہلے مذہبی اور علمی زبان سنسکرت تھی لیکن ''بودھ نے اپنے پیام کی تبلیغ کے لیے عام بول چال کی زبان اختیار کی۔۔۔ ان دنوں بودھ کے وطن میں ہندی، آری، زبان کی مشرقی بولی رائج تھی۔[۱۰۷] بدھ مت کے پرچار کے جگ میں سنسکرت کی جگہ ان پراکرتوں نے لے لی جو عام لوگوں میں بولی جاتی تھی۔ ایک ہزار برس تک ان پراکرتوں کا دور دورہ رہا۔[۱۰۸] بدھ عہد میں جن مملکتوں کے سربراہوں نے بودھ مذہب کو تسلیم کیا۔ انھوں نے نہ صرف مذہبی یا تہذیبی طور پر اس کی خدمت انجام دی بلکہ لسانی سطح پر بھی ایک خاص تبدیلی آئی اور اس تبدیلی سے جین حکومت یا موریا خاندان کی عسکری خدمات کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں فارس سے آنے والی افواج کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس افواج کی زبان چونکہ سنسکرت کی ماں جائی بہن تھی اور یہ دونوں ایک ہی گھر کی بیٹیاں تھیں اس لیے ظاہری اختلاف کے باوجود فوراً پہچان لی گئیں۔ اور ہندوستان کی سرزمین میں یہ پہلا اور اولین موقع تھا کہ سنسکرت، ژند اور دیگر

فارسی زبانیں ہم آغوش ہوئیں۔[۱۰۹] ایرانی اپنی تاریخ رقم کر رہے تھے کہ یونان سے ایک آندھی سکندر کی صورت اٹھی اور اس نے ایران اور ہندوستان کے کچھ حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سکندرِ اعظم ۳۲۷ ق م میں ایران کو تہِ تیغ کرتا ہوا ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ کچھ فارسی مؤرخین نے قنوج تک اس کے پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن بابو شیو پرشاد اور دیگر ہندوستانی مؤرخین اس کو رد کرتے ہیں اور رقم طراز ہیں کہ ''فارسی تاریخوں میں یہ بات غلط لکھی ہے کہ وہ قنوج تک آ چکا تھا کیونکہ خود سکندر کے ساتھی لوگ اپنی یونانی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ وہ ستلج کے اس پار نہیں اتر سکا۔ گنگا کے درشن کی اس کی آرزو اس کے دل میں رہ گئی۔''[۱۱۰]

یہ حقیقت ہے کہ ''سکندر کے جرنیل قنوج تک نہیں پہنچ سکے۔ لیکن ستلج یا بیاس کے کناروں تک پہنچنے کی تصدیق اکثر مؤرخین نے کی ہے۔''[۱۱۱] سکندر کے واپس جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد یعنی ۳۰۵ قبل مسیح میں اس کے ایک فوجی جرنیل سلیوکس کی سرکردگی میں یونانیوں نے دوبارہ ہندوستان پر یورش کی لیکن شکست کھائی۔ بعد ازاں دونوں حکمرانوں میں صلح ہوگئی، سلیوکس نے اپنی لڑکی کی شادی چندر گپت سے کر دی اور لڑکی کو جہیز میں کابل، ہرات اور قندھار کا علاقہ دیا۔[۱۱۲] یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ یونانیوں نے علمی لین دین جو کچھ بھی کیا ہو ہندوستان پر ان کی تہذیب و زبان کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ اردو میں استعمال ہونے والے یونانی الفاظ یا تو عربی اور فارسی کے ذریعے داخل ہوئے یا پھر بعد میں انگریزی کے ذریعے آئے۔ البتہ کچھ الفاظ ایسے بتائے جاتے ہیں جو یونانیوں کے جانے کے بعد برِصغیر میں رہ گئے اور یہ الفاظ جہاں انگریزی میں سمو گئے وہاں اردو کا حصہ بھی ہیں جیسے ہمارے ہاں آج بھی لڑکی کا نام زویا رکھ دیا جاتا ہے۔ زویا لفظ یونانی زبان کا ہے جس کے معنی خالص زندگی ہیں۔ اسی طرح صوفیا، بائبل، اکانومی، ڈاک (ڈاکٹر)، فون، گرائمر، فیلسوف (فلسفی) وغیرہ۔ شاید یونانی الفاظ کا استعمال اس لئے بھی اردو زبان میں نہیں ہو پایا کہ یونانی الفاظ برِصغیر کے ماحول سے مطابقت نہیں رکھتے تھے اور کافی مشکل تھے جن کے بولنے میں دقت پیش آتی تھی۔ پاکستان کے شمالی علاقوں، کالاش اور کافرستان کی آبادیوں کے بارے میں یہ روایت ہے کہ سکندرِ اعظم کے لوٹنے کے بعد جو لوگ اس علاقے میں رہ گئے تھے۔ یہ ان کی نسل میں سے ہیں اور تاریخ بتاتی ہے کہ سکندر کے جانے کے بعد بہت سے لوگ کوہ ہندوکش کے شمال میں آباد ہو گئے۔ یہ لوگ ۲۵۰ ق م میں خود مختار ہو گئے۔ اور باختر کے نام سے ایک حکومت وجود میں آئی۔ کچھ ہی عرصہ

بعد باختر نے شمال مغربی ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ اور اس کے بعد اس کی فوجیں مالوہ اور مگدھ کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنے لگیں لیکن کامیاب نہ ہوسکیں۔ اس ناکامی کے باعث ان کی مملکت کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک کا مرکز بلخ رہا اور دوسری کا ساگلا (سیالکوٹ) ہو گیا۔ اس مشرقی مملکت کا سب سے مشہور بادشاہ مینانڈر تھا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ بدھ کا پیرو ہو گیا تھا۔ [۱۱۳] باختریوں کا خاتمہ سیتھیوں کے ہاتھوں ہوا۔ [۱۱۴] ای۔ جے۔ اسمتھ کے مطابق ۱۳۸ ق م میں پارتھیا کے میتھر یڈیٹس اول (Mitharidates-1) نے دریائے سندھ اور جہلم کے درمیان واقع ٹیکسلا کی ریاست پر قبضہ کرلیا۔ [۱۱۵] اس کے بعد تین ساکا (Sakas) حکمران پنجاب اور شمال مغربی سرحدی علاقوں پر حاکم رہے۔ سک چونکہ خانہ بدوش تھے اور خانہ بدوشوں کی ایک مخصوص زبان ہوتی تھی۔ لہٰذا انھوں نے جب پنجاب اور شمالی علاقوں پر قبضہ کیا تو ان علاقوں پر ان کی زبان کے اثرات ظاہر ہوئے۔ جن میں سے کچھ خاص طور پر پنجاب میں آج بھی بولے جاتے ہیں۔

ہندوستان پر عسکری یلغاروں کا یہ سلسلہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے پہلے کبھی شمال مشرق سے اور کبھی شمال مغرب سے جاری رہا۔ قومیں آتی رہیں، حکومتیں بنتی رہیں۔ تہذیب کے ساتھ ساتھ لسانی اثرات کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ اور زبان نامعلوم طریق سے دراوڑی، آرین، ویدک، سنسکرت اور پراکرت میں تبدیل ہوتی رہی۔ ایرانیوں کے حملے چونکہ زیادہ ہوئے۔ اس لیے ایرانی زبانوں نے ہندوستان کی زبانوں پر زیادہ رنگ چڑھایا۔ بہ نسبت دیگر حملہ آوروں کی زبانوں کے۔ نوشیروان کے عہد میں اس کی جرار فوج جب گجرات کی راجدھانی (بلبھی پور) پر حملہ آور ہوئی تو معمولی سی جنگ کے بعد صلح ہو گئی۔ اب چونکہ ایران کی فارسی زبان میں بھی بہت زیادہ تبدیلی آ چکی تھی۔ گویا کہ اب جدید فارسی کا دور دورہ تھا۔ لہٰذا ایک طرف تو عسکری جوانوں کے یہاں کے لوگوں کے ساتھ میل جول نے جدید فارسی زبان کے اثرات مرتب کیے اور دوسرا ''آپس کے تعلقات کو استوار کرنے اور دائم و قائم رکھنے کے لیے نوشیروان کی پوتی راجہ ایدھر سے بیاہ دی گئی۔ اور اس طرح اتحادِ نسل کے ساتھ ساتھ دو ملکوں کی زبانوں میں بھی کامل اتحاد کی صورتیں پیدا ہو گئیں۔'' [۱۱۶]

موریا سلطنت کی تباہی کے بعد تقریباً پانچ سو سال تک ہندوستان میں کوئی مرکزی حکومت دکھائی نہیں دیتی۔ ۳۲۰ء میں ایک نیا چندر گپت ابھرا جس کے جانشینوں نے بہت بڑے پیمانے پر موریہ خاندان کی سطوت و شکوہ کو دوبارہ حاصل کرلیا۔ [۱۱۷] پانچویں صدی عیسوی میں ہُن،

گورجرہ (Gurjaras) ودیگر قبائل نے شمال مغربی ہند پر حملے کئے بعد ازاں تقریباً ۵۰۰ء میں ہن قبیلے کے سردار تورامنا (Toramana) نے مالوہ پر قبضہ کیا۔ اس کا لڑکا مہر گل (Mihiragula) ایک وسیع سلطنت پر حکومت کرتا رہا۔[۱۱۸] ہن اگرچہ تورانی نسل کے خانہ بدوش تھے لیکن وہ منگولیا کی ایک طاقت ور ریاست کے مالک تھے۔ جنہوں نے چین کو روند ڈالا تھا۔ دوسری طرف انہوں نے یونان، جرمنی، فرانس، اٹلی اور ہنگری پر بھی حملے کیے تھے۔ ہنوں کو گولڈن ہورڈ (Golden Hords) بھی کہا جاتا ہے۔[۱۱۹] گولڈن ہورڈز کا اُردو میں ترجمہ اردوئے زریں کیا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو لفظ کے حوالے سے ایک نظریہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ لفظ اردو ہورڈز سے نکلا ہے۔ ہنوں کے حملوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے ہند آریائی روایات کے اخلاقی معیار کو گرا دیا۔ اور کئی ایسے توہمات کو فروغ دیا جنہیں آریہ ورت کے عظیم بھگت اور روحانی معلمّ بھی مٹا نہ سکے۔[۱۲۰] دوسرے اثرات لسانی تھے کہ اس دور میں جو زبانیں بولی جارہی تھیں ان میں چند الفاظ نئے داخل ہوئے جو روایات کے حوالے سے تو تھے لیکن پذیرائی نہ پا سکے۔

دراصل یہ دور جدید بولیوں کا تھا کیونکہ "سنسکرت دور کے بعد عوامی بولیوں یعنی (۵۰۰ قبل مسیح سے ۴۰۰ء تک)۔ ہند کے مختلف حصوں میں مختلف پراکرتوں کا ارتقا شروع ہوا۔ مہاراشتری، سینی، ماگدھی، اردما گدھی اور پشاچی وغیرہ اس دور کی اہم پراکرتیں ہیں۔[۱۲۱] ہر پراکرت کا نام اس دیس کے کسی نہ کسی علاقے سے منسوب کیا گیا تھا۔ لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ پراکرت اس علاقے کی نمائندہ ہوتی۔ پراکرتوں کے بعد اپ بھرنش بولیوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ اور "جب اُپ بھرنش سارے شمالی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی تو جدید بولیاں وجود میں آنی شروع ہوئیں۔ اردو کا تعلق ان میں سے ایک بولی سے ہے جو ترقی کر کے زبان کی صورت اختیار کر گئی۔"[۱۲۲] یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے اور عام فہم بھی یہی ہے کہ باہر سے آنے والی اقوام اور افراد مقامی زبان میں تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ہندوستان میں جو لسانی تبدیلیاں سامنے آئیں یہ ان ادوار میں باہر سے آنے والے حملہ آوروں کی وجہ سے ہوئیں اور حملہ آور عسکری تھے۔

اسلام سے پہلے اگرچہ بہت سی زبانوں کے الفاظ ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں میں شامل ہو چکے تھے لیکن عربی کے الفاظ کی شمولیت اسلام کی آمد کے بعد ہی ثابت ہوتی ہے۔ کئی مورخین نے لکھا ہے کہ عربوں کی ہندوستان میں آمد تجارتی اغراض کے لیے اسلام سے پہلے سے

تھی لیکن اس کے اثرات رونپذیر نہیں ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ بن خطاب جمادی الآخر ۱۳ھ میں خلیفہ ہوئے۔ اور ذی الحجہ ۲۳ھ میں شہید کیے گئے۔ آپ نے خلافت سنبھالتے ہی ۱۵ھ/۶۳۶ء میں جب حضرت عثمان بن ابی العاص کو بحرین اور عمان کا گورنر بنا کر بھیجا تو انھوں نے اپنے بھائی حکم بن ابو العاص کو فوج دے کر گجرات روانہ کیا۔ بمبئی کے قریب تھانہ بھروچ وغیرہ فتح کر کے یہ فوج سالم وغانم واپس گئی اور دوسری دفعہ حکم بن ابی العاص نے بھروچ کے ساحلی علاقوں پر حملہ کیا۔ اور اپنے بھائی مغیرہ بن ابی العاص کو دیبل (دیول) جو بندر لاہری سے ۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے اس پر حملے کے لیے بھیجا اور دونوں جگہ کامیابی حاصل کی۔[۱۲۳] لیکن اس سے دو سال پہلے ۶۳۴ء میں عربوں کے لشکر پہلی بار بلوچستان میں داخل ہو چکے تھے جس کے نتیجے میں بہت سے عرب خاندان مکران اور خضدار میں آباد ہو گئے۔ اب یہاں پانچ اقوام عرب، ایرانی، ترک، پٹھان اور بلوچ تھیں۔ ان سب کی زبانیں الگ الگ تھیں۔ عربی، فارسی، ترکی، پشتو اور بلوچی۔[۱۲۴]

حضرت عمرؓ کے عہد کے ابتدائی سالوں میں ہی ان دونوں حملوں سے جہاں مسلمان عساکر ایک طرف شمال مغربی ہند کے ایک علاقے میں داخل ہوئے تھے وہیں بمبئی تک بھی پہنچ گئے۔ اور عساکر کے ان لوگوں سے لین دین اور بول چال سے عربی زبان کے بہت سے الفاظ ان زبانوں میں شامل ہو گئے۔ محمد علافی ایک عرب نژاد بھی اس زمانہ میں اپنے جیش سے علیحدہ ہو کر اپنے رفقا سمیت راجپوتانہ آیا اور ہندی بن کر وقت گزارنے لگا۔[۱۲۵] اس کے رفقا کی ایک جماعت جب ان لوگوں میں رہنے لگی تو دو زبانیں دو لہجے ایک دوسرے میں ضم ہو کر فطرت کے مطابق ابھرنے لگے۔ اس واقعہ کے تقریباً ۲۸ سال بعد" ۶۶۴ء میں مہلب بن ابی صفرہ نے ملتان پر قبضہ کیا۔[۱۲۶] یہ یاد رہے کہ اہلِ عرب اپنے ملک سے باہر اپنی عورتوں کو نہیں لے جاتے تھے لہٰذا وہ جہاں جاتے مجبوراً وہاں کی عورتوں سے رشتۂ ازدواج قائم کرتے اور جو زمینیں انہیں صلۂ جنگ میں ملتیں اس کا بندوبست وہ وہاں کی رعایا کے ساتھ ہی کرتے۔ یہ دونوں صورتیں وہ تھیں جن سے رابطے مضبوط ہوتے اور قائم رہتے، لسانی تبدیلی کا سبب بھی بنتے۔

صوفی کرم الٰہی ڈنگوی نے مکران کی فتح کا واقع ۲۳ھ [۱۲۷] لکھا ہے جب کہ انور رومان نے انگریزی سن میں ۶۴۳ء تحریر کیا ہے۔[۱۲۸] یہ دونوں سنین یعنی ۲۳ھ اور ۶۴۳ء صرف دو مہینوں محرم، صفر/نومبر دسمبر ایک دوسرے کے ساتھ چلے کیونکہ یکم ربیع الاول ۱۷ جنوری کو ۶۴۴ سنِ عیسوی

شروع ہو گیا تھا۔

''خلافتِ فاروقی میں عرب کے ہندوستانی جاٹ اور سیابجہ برضا ورغبت مسلمان ہو کر اسلامی فوج میں عطایا و وظائف کے مجد و شرف کے ساتھ داخل ہوئے اور انہوں نے عجم کی فتوحات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں کئی علاقوں نے بغاوت کی راہ اختیار کی۔ جن میں مکران اور سندھ بھی شامل تھے۔ حضرت عثمانؓ نے بغاوت کو (عسکری) طاقت کے ذریعے ختم کر کے مکران میں مستقل طور سے ایسے امراء و عمال رکھے جنہوں نے حالات کی بحالی کے لیے پوری کوششیں کیں۔ اس زمانہ میں عربوں نے بلوچستان میں اپنی آبادیاں قائم کیں۔۔۔اور فوجی طاقت قائم رکھی۔۔۔ حضرت علیؓ کے عہد میں مکران کے آگے سندھ میں مسلمانوں کو خصوصی اقتدار حاصل ہوا۔''[۱۲۹]

حضرت معاویہؓ کے دور میں (۴۴ھ/۶۶۴ء) مہلب ابن ابی صفرہ نے اس علاقے میں جہاد کے تسلسل کو جاری رکھا۔ قاضی محمد اطہر مبارک پوری نے کتاب الفتوح سے نقل کیا ہے کہ ''مہلب ابنِ ابی صفرہ نے سرہند پر چڑھائی کی پھر بنہ اور لاہور جو کہ ملتان اور کابل کے درمیان دو شہر ہیں پہنچے۔ وہاں دشمن سے مقابلہ ہوا اور دشمن شکست کھا کر مع اپنے ہمراہیوں کے جہنم رسید ہوا۔ ازدی کہتا ہے:

الم ترأن الا زد ليلة بيتوا

بنه كا نواخير جيش المهلب

(کیا تم نے نہیں دیکھا کہ قبیلہ نے جو رات بنہ میں گزاری وہ مہلب کے سب سے بہترین لشکر تھے۔)[۱۳۰] یہاں ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے خیال میں ''بنہ'' شہر بنوں اور لاہور ضلع صوابی کا قصبہ چھوٹا لاہور ہوگا۔ کیونکہ یہ دونوں شہر کابل اور ملتان کے درمیان واقع ہیں اور قدیم شہر ہیں۔ لاہور کی اپنی اہمیت ہے۔ یہی وہ لاہور ہے جہاں تقریباً ۵۰۰ ق م میں سنسکرت گرائمر کا بانی پانی رہائش پذیر تھا۔ بہر حال والی سجستان عباد بن زیاد (۵۳ھ) سندھ اور کچھ فتح کرتے ہوئے گجرات کی بندرگاہ قندھار (گندھارا) آئے۔[۱۳۱] خلفائے راشدین، حضرت معاویہؓ

اور پھر ولید بن عبدالملک کے دور میں فتوحات اور استحکامِ مملکت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ عسکری حملوں سے جہاں عربی زبان کو پھیلنے کا موقع ملا۔ وہیں بلوچستان اور سندھ میں بولی جانے والی زبانوں میں فطری تبدیلی آنے لگی۔ سندھ سے لوگ جو عربی فوج کا حصہ بنے وہاں انھوں نے اپنے اثرات چھوڑے یوں اردو زبان کی بنیاد میں مختلف زبانوں کے الفاظ اپنا اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ اور نئی زبان کے لیے راہیں ہموار ہوتی رہیں۔

حکومت اسلامیہ کے قیام کے ۴۸ سال بعد ولید بن عبدالملک کے عہد میں عراق کے گورنر حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو سندھ و ہند کی طرف بھیجا۔ محمد بن قاسم کی فوجوں نے راجہ داہر کو شکست دی اور اپنی حکومت قائم کی۔ سندھ میں مسلمانوں نیز عربوں کی یہ ایسی حکومت تھی جس نے سندھ اور ملتان تک کے ثقافتی، سیاسی، تہذیبی اور لسانی ڈھانچے کو بدل کر رکھ دیا۔ سندھ میں عربی رسم الخط رائج ہوا۔ محمد بن قاسم بذاتِ خود عربی زبان کا ایک اچھا شاعر تھا۔ اس فوج میں دیگر بھی کئی ادیب اور شعراء تھے لیکن ابھی تک جو تبدیلیاں رو پذیر ہو رہی تھیں وہ اجتماعی تھیں۔ انفرادی یا شخصی سطح پر کسی اہلِ قلم کا نام لینا مشکل ہے کہ اس نے اردو زبان کی اس ابتدائی کاوش میں کیا کردار ادا کیا۔ محمد بن قاسم کی ان فتوحات (۷۱۲ء۔۷۱۳ء) کے بعد سندھ میں مسلمانوں کی نو آبادی قائم ہوگئی جس سے ہندوستانی زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہونا شروع ہوا۔ چنانچہ اسلامی عقائد اور طرزِ فکر کی تبلیغ بھی اس وقت سے شروع ہوئی۔ لین پول کی روایت کے مطابق ہر سال ۵۰ ہزار اہلِ ہند اسلام قبول کرتے تھے۔[۱۳۲]

ان نومسلموں اور بیرونی مسلمانوں کی آپس میں بول چال نیز دیگر علاقے میں بسنے والی اقوام کے ساتھ تبادلۂ خیال اور تبادلۂ اشیاء کے وقت بولی جانے والی زبان عربی، فارسی آمیز مقامی زبان ہوا کرتی تھی۔ اس حوالے سے بہت سے مؤرخین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی اس حوالے سے رقم طراز ہیں کہ ''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں اس لیے قرینِ قیاس یہی ہے کہ جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں۔ اس کا ہیولا اسی وادیِ سندھ میں تیار ہوا ہو گا۔''[۱۳۳] سید سلیمان ندوی نے محمد بن قاسم اور اس کی فوجوں کی آمد کو ہی پہلا ہیولا قرار دیا ہے۔ گویا اب ''مسلمان ہندوستانی رسم و رواج اور زبان سے متاثر ہو رہے تھے۔ اور ایک مخلوط زبان کی نیو پڑ رہی تھی۔''[۱۳۴] ہمارے ماہرینِ لسانیات اپنی اپنی فکر کے مطابق اپنی حدود متعین کرتے رہے۔

اور بہت کم لوگوں نے دھرتی سے ابھرنے والی اس پہلی زبان کی طرف اشارہ کیا ہے جو آج کی اُردو زبان کی حقیقی بنیاد تھی اور جس کا ذکر ابتدا میں ہو چکا ہے۔ بہر حال یہ سفر جاری رہتا ہے۔ نظریات میں اختلافات اسے تقویت پہنچاتے رہتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی کے اسی نظریے کو کالا سنگھ بیدی نے یوں آگے بڑھایا کہ ۱۲ء میں اردو زبان کا بیج بویا گیا اور اس کا ہیولا ملتان میں ہی تیار ہو گیا اور پنجاب میں عہدِ طفلی کو حاصل کیا اور آخر میں برج بھاشا کی گود میں پرورش پائی۔ [۱۳۵]

''محمد بن قاسم کے بعد ۱۰۷ھ میں جنید بن عبدالرحمٰن نے سندھ میں استحکام کے بعد گجرات کا رخ کیا اور مارواڑ اور وہاں سے مانڈل۔۔۔اور پھر بھروچ پہنچے۔ اور حبیب بن مرہ کو اجین کی طرف بھیجا۔ اسی سفر میں بھرمد اور بھیل مان کے گجراتی علاقے فتح ہوئے۔۔۔ ۱۴۰ھ کے لگ بھگ خلیفہ منصور عباسی کی طرف سے ہشام بن عمرو ثعلبی حاکمِ سندھ نے عمر بن جمل کو گجرات کی طرف روانہ کیا۔ جو بھروچ کے قریب باربُد (بھاڑ بھوت) پر لنگر انداز ہوئے اور خود ہشام بن عمرو نے گندھارا کا رخ کیا۔۔۔ خلیفہ مہدی عباسی نے ۱۵۹ھ/ ۷۷۵ء میں عبدالمالک بن شہاب سمعی کو بھیجا۔۔۔ جنھوں نے بھاڑ بھوت کو فتح کیا۔۔۔ اس سے تقریباً چالیس سال بعد مامون کے دورِ خلافت میں فضل بن ماہان نے بمبئی اور سورت کے درمیان سندان، نامی ساحلی شہر فتح کیا۔'' [۱۳۶]

یہ عسکری فتوحات ہندوستان کے مختلف علاقوں کو اپنے حلقہ میں لے رہی تھیں۔ مسلمانوں کی افواج میں عربی اور فارسی زبان بولنے والوں کے علاوہ برِ صغیر کے مختلف علاقوں کی مقامی بولیاں بولنے والے عسکری بھی شامل تھے۔ یہ لوگ جن جن علاقوں میں پہنچے ان میں سے کئی سپاہیوں نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ انھوں نے وہاں شادیاں کیں اور اسی تہذیب کا حصہ بن گئے۔ اس وقت ہندوستان میں متعدد زبانیں / بولیاں رائج تھیں۔ جو ملک کے مختلف حصوں میں بولی جاتی تھیں۔ ان میں سے چند خاص زبانیں جو امتیازی درجہ رکھتی تھیں۔ درج ذیل ہیں۔

۱۔ سورسینی یا شورسینی (دوآبہ پنجاب میں)

۲۔ ماگدھی (مشرقی ہندو مگدھ میں)

۳۔مہاراشٹری (مہاراشٹر میں)

۴۔اونتی (راجستھان میں)

۵۔وراچڈی (سندھ میں)

۶۔اودھ ماگدھی (اودھ و بندیل کھنڈ میں)

ان کے علاوہ دکن میں ہندوستان کی قدیم زبانیں تلنگی، کنٹری، تامل، ملیالم رائج تھیں۔[۱۳۷]

مؤرّخین اور ماہرینِ لسانیات میں سے کئی ایک نے انھیں بولیاں لکھا ہے کچھ نے پراکرتیں کا نام دیا ہے اور چند ایک نے اُپ بھرنش سے تعبیر کیا ہے۔ پراکرتیں اور بولیاں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مختلف اقسام، مزاج اور زبان بولنے والے طبقوں کے مسلسل میل جول سے وجود میں آیا کرتی ہیں۔ اور جب ان کی ضرورت نہ ہو تو یہ خود بخود مٹ جایا کرتی ہیں۔''[۱۳۸] اگر اس خیال کے مطابق مندرجہ بالا زبانوں پر غور کیا جائے تو ان میں سے بہت سی زبانوں بلکہ تقریباً تمام زبانوں کا وجود ختم ہو چکا ہے یا وہ جدیدیت میں ڈھل گئی ہیں۔ یا کسی دوسری زبان میں ضم ہو کر رہ گئی ہیں تو یوں انہیں زبانیں کہنا درست نہیں لہٰذا ان پراکرتوں یا بولیوں میں سے ماہرینِ لسانیات نے جس پراکرت کو سب سے وسیع رقبہ میں پھیلا ہوا بتایا ہے وہ سورسینی ہے یہ پراکرت صرف دوآبہ پنجاب تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ اسی کا دوسرا نام ''برج بھاشا ہے یہ زبان۔۔۔سندھ سے بہار اور لاہور سے مالوہ تک بولی جاتی''[۱۳۹] تھی۔

جب اپنے اپنے علاقوں میں ان پراکرتوں کا بول بالا تھا اور سندھ و ہند میں مختلف علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور ایک نئی تبدیلی آہستہ آہستہ اپنے وجود میں آنے کا احساس دلا رہی تھی تو ان عرب سپاہیوں نے جو مستقل طور پر یہاں آباد ہوئے، شادیاں کیں اور ان کی اولادیں ہوئیں انھوں نے دھیرے دھیرے پنپنے والی اس تبدیلی/زبان کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

۴۔اُردو کا ارتقائی عمل

دسویں صدی میں جب کہ ہندوستان میں پشاور سے لاہور تک کے علاقہ میں راجہ جے پال حکمران تھا۔ ''اس نے ریاست کو بڑھانے کی غرض سے غزنی پر حملہ کر دیا۔ لیکن شکست کی صورت میں بہت سا مال و اسباب دے کر صلح کر لی۔ بعد میں جب سامان دینے سے انکاری ہوا تو

غزنی کے حکمران سبکتگین نے ۹۷۷ء میں ایک بہت بڑی جنگ کے بعد پشاور پر قبضہ کر لیا۔''[۱۴۰]
اس قبضے سے غزنی کی افواج کو ہندوستان میں آنے کا موقع ملا۔ اس سے سبکتگین کی سلطنت کی حدیں جیحوں سے دریائے سندھ تک پھیل گئیں۔ اور ہندوؤں کی متحدہ قوت بھی اتھل پتھل ہو گئی۔
۹۹۷ء میں سبکتگین کی وفات ہوئی تو راجہ جے پال نے سبکتگین کے بیٹے سلطان محمود کو نوجوان، ناتجربہ کار اور میدانِ جنگ سے ناواقف سمجھتے ہوئے غلط فہمی کا شکار ہو کر دوبارہ پر پرزے نکالنے شروع کیے۔ اور اسے کمزور سمجھتے ہوئے پشاور پر حملہ کر دیا۔ جس میں نہ صرف راجہ کو شکست کھانا پڑی بلکہ اس نے خودکشی کر لی۔ اب سلطان محمود نے حملوں کا سلسلہ جاری رکھا اور اپنے بتیس سالہ دورِ حکومت میں جہاں ہندوستان میں قنوج سے لے کر گجرات تک کے اکثر راجاؤں کو اپنا باجگزار بنا لیا وہیں افغانستان، خراسان، ایران اور ترکستان وغیرہ بھی اس کے قبضے میں آ گئے۔ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے۔ ان حملوں میں اس کی فوج میں شامل سپاہی مختلف علاقوں کے رہنے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے تھے لیکن آلِ غزنہ کے حکمران اور اس کے سپاہ زیادہ تر فارسی اور ترکی زبان بولتے تھے۔ پنجاب میں یہ حکومت کم و بیش پونے دو سو سال تک قائم رہی۔ اس عرصہ میں مختلف علاقوں، بولیوں کے لوگ نیز ترکی اور فارسی بولنے والے فاتحین نے مذہبی اور سماجی ضروریات کے تحت مقامی زبان کو اپنی بول چال میں استعمال کرنا شروع کیا اور یوں ایک نیا لب و لہجہ جو پنپنے لگا اور سامنے آیا اسے ہندوستان کی نسبت سے ہندی یا ہندوی کہہ کر پکارا جانے لگا۔
اسی دوران ''کالنجر کے راجہ نندی نے ایک قصیدہ ہندی زبان میں کہہ کر سلطان محمود غزنوی کو بھیجا جس کے عوض سلطان نے اسے چند قلعوں کا حاکم مقرر کر دیا۔''[۱۴۱] نیز سلطان محمود نے جو سکے رائج کیے اُن پر بھی سنسکرت یا مقامی زبان کے الفاظ کندہ کرائے مثلاً سکے کے سیدھی طرف کندہ تھا:

''اُویکتَےَ کم محمدؐ اوتارم نرپت محمودم (ذاتِ مطلق واحد ہے محمدؐ اس کے اوتار ہیں۔ محمود سلطان ہے)۔''[۱۴۲]

سکے کی پشت پر یہ الفاظ کندہ تھے:

''اویکتو یہ نام انیہ ٹنکہ محمود پورے گھٹتم تاجکی ییں سنوتا۔
(اس واحد مطلق کے نام پر یہ ٹنکہ محمود پور میں گھڑا گیا)۔''[۱۴۳]

اس عبارت میں اویکت میکم اور اوتار' ہندو عقیدے کی مخصوص اصطلاحیں ہیں۔

اویکت میکم اس ذاتِ مطلق کے لیے اور اُتار پیغمبر کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔

سلطان محمود غزنوی جب ہندوستان آیا تو اس کی فوج میں کئی شاعر اور ادیب بھی شامل تھے۔ انہی میں ''ایران کا مشہور شاعر منوچہری بھی لاہور آیا تھا۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو جس میں ہمیں فارسی اور ہندوی دونوں الفاظ ساتھ ساتھ جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ منوچہری لکھتا ہے:

الاتا مومناں دارند روزہ
الاتا ہندواں گیرند لنکھن [۱۴۴]

''محمود غزنوی کے دربار سے کئی ہندو سپہ سالار اور کئی دانشور وابستہ تھے۔ جن میں تلک، ناتھ اور گوبند کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔''[۱۴۵] مزید یہ کہ محمود کے لشکر میں ہندوستان کے سپاہی اور عہدے دار بھی شامل ہو چکے تھے۔ محمود کی فوج میں ہندو یا ہندوستانی امراء جو شامل تھے وہ محض جنگی معرکوں میں رہبری ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ہندوستانی معاشرت اور زبان و تہذیب سے متعلّق مسلمانوں کو معلومات بھی فراہم کرتے تھے۔ گویا کہ وہ مسلمانوں کی فوج میں ہندوستان کے تہذیبی سفیر بھی تھے۔ مذکورہ بالا تلک نامی ہندو ''سلطان مسعود شہید کے عہد میں سندر سپہ سالار کی وفات پر ہندو فوجوں کا افسر بنایا گیا۔ اور ینالتگین والئ ہند کی سرکوبی کے لیے جس نے بغاوت کا اعلان کیا تھا ہندوستان بھیجا۔''[۱۴۶]

صاف ظاہر ہے کہ ان سپہ سالاروں یا سالاروں نیز لشکریوں کی آپس میں بات چیت ہوتی تھی جس سے فریقین ایک دوسرے کا مفہوم سمجھتے تھے۔ ان سالاروں کے ساتھ ان کے اپنے دستے بھی ہوتے تھے جن کا تعلق عموماً ہندوستان سے ہوتا تھا۔ یہ دستے / سپاہی مسلمان سپاہ کے ساتھ شانہ بشانہ ہندو افواج سے برسرِ پیکار ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں ''محمود غزنوی کی خراسان اور اس کے ملحقہ علاقوں کی فتوحات زیادہ تر تلک اور اس کی ہندو فوج کی مرہونِ منت ہیں۔ محمود غزنوی کی چھاؤنیاں وہ پہلی جگہ ہیں جہاں فارسی اور مقامی زبان بولنے والے یک جا ہوئے۔''[۱۴۷]

محمود غزنوی بذاتِ خود تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ فرماں روا تھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت دینی اور ادبی مطالعہ میں صرف کرتا تھا اور ہمیشہ علم کی تلاش میں رہتا تھا اس نے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندی علوم و مذاہب کی اتنی اچھی استعداد حاصل کی کہ ان مذاہب پر ایک نہایت جامع کتاب تالیف کی۔ محمود اسلامی قانون، فقہ اور احادیث کا درس لے چکا تھا اور حافظِ قرآن تھا۔ فقہ پر بھی اس نے

ایک کتاب لکھی۔ شعروشاعری میں اس کا ادراک بہت بلند تھا وہ خود بھی ایک شاعر تھا۔[۱۴۸] نیز وہ ریختہ طرز کی ہندی بول اور لکھ سکتا تھا۔ ان مذکورہ حالات سے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ ہندی / ہندوی اردو کی صورت آدھا تیتر آدھا بٹیر والی کیسے متشکل ہوئی ہوگئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مسعود نے سعد بن سلیمان کے ہاں ۴۳۸ھ، ۴۴۰ھ بمطابق ۱۰۴۶ء، ۱۰۴۹ء کے درمیان لاہور میں جنم لیا اور مسعود سعد سلیمان کے نام سے شہرت پائی۔ جب وہ ''سنِ رشد کو پہنچا تو ابراہیم غزنوی کے دربار میں رسائی ہوئی اور پھر سیف اللہ محبوب بن ابراہیم کے ہمراہ اسے مختلف جنگوں میں حصہ لینے کا موقع ملا وہ چند ایک بڑے امراء میں شمار ہوتا تھا۔''[۱۴۹] قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، جالندھر کا حاکم رہا اور ۵۱۵ھ، ۱۱۲۱ء کو وفات پا گیا۔ ماہرینِ اردو کی تقریباً متفقہ رائے یہ ہے کہ ''او را سہ دیوان است یکے بتازی و یکے بپارسی و یکے بہندوی، بداں سبب او در سلک شعرائے ایں طبقہ منخرط گردانیدہ اند۔''[۱۵۰] مسعود سعد سلیمان کا دیوانِ ہندوی چونکہ نایاب ہے اس کا فارسی دیوان موجود ہے جس سے اس زمانے کی بول چال کے نمونے مل سکتے ہیں اس کا شعر ہے جس میں ''خواجہ نے ایک ہندی محاورہ استعمال کیا ہے۔

چو رعد ز ابر بغرید کوس محمودی

برآمد از پسِ دیوار حصن مارا مار [۱۵۱]

پروفیسر عبدالغنی نے بھی مسعود کا ایک شعر نقل کیا ہے جس میں برشگال کا لفظ آتا ہے۔

برشگال اے بہارِ ہندوستان

ای نجات از بلائے تابستاں [۱۵۲]

محمد علی عوفی نے پہلی بار ہندوی کا پہلا شاعر مسعود سعد سلیمان کو لباب الالباب میں گردانا۔ جس کی تائید میں حضرت امیر خسرو نے غرۃ الکمال میں تذکرہ کیا اور پھر آنے والے تمام محققین نے اس کی پیروی کی سوائے حافظ محمود شیرانی کے جنھوں نے اپنے شبہات کا اظہار کیا۔ اگر محمد علی عوفی کی اس بات کو درست سمجھا جائے تو آخر مسعود سعد سلمان کا کوئی ایک آدھ شعر تو ہندوی میں سامنے آنا چاہیے تھا جب کہ اس کے باقی دونوں دیوان محفوظ کر لیے گئے بہر حال مسعود کی فارسی شاعری سے اس کی ہندی دانی کے ثبوت بڑی تعداد میں مل سکتے ہیں۔

اہلِ غزنہ کے بعد ہندوستان پر اہلِ غور نے قبضہ جمایا۔ شہاب الدین محمد غوری (م:۲

شعبان ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء) نے ۱۱۸۶ء میں خسرو ثانی (آخری غزنوی حکمران) کو گرفتار کرلیا۔۔۔
۱۱۹۳ء میں اجمیر کے راجہ پرتھوی راج اور اس کی متحدہ فوج کو شکست دی۔ ۱۱۹۴ء میں بنارس کو بھی فتح کرلیا۔[۱۵۳] یوں محمد غوری برصغیر پاک و ہند کا پہلا فاتح جرنیل ہے۔ جس کی مہمات کا دائرہ پنجاب اور سندھ تک ہی محدود نہ رہا بلکہ گجرات کاٹھیاوار، دہلی، اجمیر اور بنارس تک کے علاقوں تک پھیل گیا۔ پرتھوی راج کے ساتھ ترائن کی جنگ میں چند کوئی نامی ایک ہندو سپاہی بھی شامل تھا۔
اس نے ۱۱۹۳ء میں پرتھی راج راسو لکھا جس کی چند سطریں بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

"پتر (خط) پائے گھال پرتھی راج ہانہہ دیں سلطانگ (سلطان) کرسلام (سلام) تہہ بار پری انگل سلطانگ (سلطان) پتر پروردگار پیگام (پیغام) روے لاہ کریم (کریم) کے بار سرطان (سلطان) جلال دین جابا سرطان سہاب دین (سلطان شہاب الدین) اللہ پایا مسلمان۔"[۱۵۴]

اسی جنگ ترائن کے دوران ایک اور تحریر سامنے آئی جو کہ اگر کسی عسکری شخصیت کی نہیں تھی لیکن اُسے الگ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تحریر پرتھوی راج کی بہن، پرتھا بائی کی ہے جو اس نے اپنے خاوند چتوڑ کے راول سمر سنگھ کے جنگ کے دوران مارے جانے پر ستی ہونے سے پہلے اپنے بیٹے کو لکھی تھی۔ اس خط کے چند جملے پڑھنے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوگا کہ اس زمانے کی زبان میں نئی ابھرنے والی زبان (اردو) کو کتنا عمل دخل ہوگیا تھا۔

"سمری حضور سمر (جنگ میں) مارے گئے اور ان کے سنگ رشی کیش جی بھی بیکنٹھ کو سدھارے ہیں۔ رشی کیش جی ان چار لوگوں میں سے تھے جو دلی سے میرے سنگ دہیز (جہیز) میں آئے تھے۔ اس لیے ان کے بنسجوں (کنبہ والوں) کی خاطری (خاطرداری) رکھنا۔ تے (اور) پاچھے مارا چیاری گراں (نوکر چاکر) منشاں (آدمیوں) کی خاطری راکھجو۔ ای (یہ) مارا جیو کر چاکر ہے جو تھا سو (تم سے) کدی (کبھی) حرام خوری نیوے گا (نہیں کرے گا)۔"[۱۵۵]

یہ خط ۱۱۹۲ء میں لکھا گیا۔ راجپوتوں کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا۔ اور وہ آئے دن کسی نہ کسی جنگ میں شامل رہتے تھے۔ آج یہاں تو کل وہاں کبھی ایک ریاست میں تو کبھی دوسری ریاست

میں لہٰذا ان کے ساتھ ایک ایسی زبان سفر میں رہتی تھی جو حاکم و محکوم میں سلسلہ تکلّم و ابلاغ کا آسان اور موثر ذریعہ بنتی ہے۔ دوسری طرف محمد غوری اور اس کے بعد اس کے جرنیل اور پنجاب کے حاکم قطب الدین ایبک کی فتوحات سے علاقائی زبان میں بڑی حد تک تبدیلی رونما ہوئی۔ دراصل عربوں اور ایرانیوں کے بعد جو لوگ برِ صغیر میں فاتحانہ داخل ہوئے وہ ترک اور افغان تھے۔ ترکی نے یہاں کی زبان کو اتنا زیادہ متاثر نہیں کیا جتنا فارسی زبان نے اثرات مرتب کیے۔ چونکہ فارسی زبان کے حملہ آور پہلے بھی کئی دفعہ اس خطہ پر چڑھائی کر چکے تھے اور تھوڑا تھوڑا عرصہ حکومت کر چکے تھے، اب محمد غوری کی فتح کے بعد اس زبان کا استعمال مزید بڑھ گیا۔ قطب الدین ایبک نے انہلواڑہ، گجرات، چندواڑ، قنوج، بدایوں، بنارس، کالنجر اور دیگر کئی مفتوحہ شہروں میں چھاؤنیاں ڈال دی تھیں۔ اور لشکری وہاں مستقلاً رہائش پذیر تھے۔ جس سے فارسی زبان اور مقامی علاقائی زبانوں کا اختلاط نئی زبان کے فروغ میں ممد ثابت ہو رہا تھا۔ اور یہ زبان ہندی یا ہندوی کے نام سے پروان چڑھ رہی تھی۔

قطب الدین ایبک (م۔۱۲۱۰ء) سے کیومرث (۱۲۹۰ء) تک تقریباً گیارہ حکمران خاندانِ غلاماں سے برسرِ اقتدار رہے۔ چونکہ ان کی پرورش ہندوستان میں ہی ہوئی تھی لہٰذا اس حقیقت کو ماننے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ وہ سرکاری زبان فارسی کے ساتھ ساتھ اپنی علاقائی اور خطے کی زبان سے بھی اسی قدر واقف ہوں گے اور ان دونوں زبانوں کے اختلاط سے علاقائی لسانیات میں خاصی تبدیلی واقع ہوئی ہوگی۔ جلال الدین فیروز خلجی نے خاندانِ غلاماں کو عسکری طاقت سے ہٹا کر خلجی خاندان کا اقتدار قائم کیا۔ خلجی حکومت تقریباً تیس سال تک قائم رہ سکی۔ ملک کے اندرونی خلفشار اور حکمرانوں کی نااہلی نے انھیں جلد ہی منظر سے ہٹا دیا۔ خلجی خاندان کے افراد نے چوتھی صدی ہجری میں اسلام قبول کیا تھا اور پھر یہ لوگ خوارزم شاہیوں، غوریوں اور سلجوقیوں کے لشکر کا حصہ رہے۔ اس خاندان کی تربیت مکمّل طور پر عسکری تھی اور کئی جنگوں بلکہ تقریباً تمام جنگوں میں شامل رہے لہٰذا جلال الدین فیروز خلجی نے جب کیقباد اور بعد ازاں کیومرث کی حکمرانی کو غوطے لگاتے دیکھا تو حکومت کی کشتی کا پتوار خود سنبھال لیا۔ چونکہ یہ لوگ خاندانِ غلاماں کی فوج کا بھی حصہ تھے اور حالات سے پوری طرح آگاہ تھے اس وجہ سے بھی انھیں زیادہ مشکلات نہیں اٹھانی پڑیں۔ لیکن حکومت سنبھال لینے کے بعد بمشکل چار حکمران ہی گدی سے محظوظ ہو سکے اور پھر مبارک خان خلجی

سے غیاث الدین ملک نے تخت پر قبضہ کر کے تغلق خاندان کو تاج شاہی پہنایا اور غیاث الدین محمد تغلق کے نام سے ہندوستان پر حکمرانی کرنے لگا۔

غیاث الدین (۱۲۶۶ء۔۱۲۸۶ء) سے لے کر محمد بن تغلق (۱۳۱۵ء) تک کے عہد میں ہندی، ہندوی، دہلوی، لاہوری یا دیگر لہجوں کو عروج نصیب ہوا۔ اردو زبان جو ابھی تک ہندی یا ہندوی کے نام سے پکاری جاتی تھی، کے ارتقاء کا اندازہ ہم اس سے لگا سکتے ہیں کہ غیاث الدین بلبن سے محمد بن تغلق تک گیارہ حکمرانوں کا زمانہ حضرت امیر خسرو نے پایا۔ اور بعض مؤرخین کے نزدیک آپ پہلے شاعر تھے جنھوں نے اردو زبان کو استعمال کیا۔ اگر چہ اس نظریہ میں اختلافات ہیں لیکن ان ادوار میں ہمیں حضرت امیر خسرو اور حسن سنجری جیسے نئی فروغ پانے والی زبان کے خدمت گار ملتے ہیں۔ اور یہیں سے شمالی ہند میں اردو تحریری طور پر ایک نئے روپ میں دکھائی دیتی ہے۔
ملک الشعراء ابوالحسن جمیل الدین یمین الدولہ امیر خسروؒ جنہیں ان کے والد امیر سیف الدین کی شہادت کے بعد مقامِ امارت پر مامور کیا گیا اور فوج کے ایک دستے کی کمان دی گئی باقاعدہ جنگوں کا حصہ رہے۔ قید کی صعوبت بھی برداشت کی اور سفر کے دکھ بھی اٹھائے۔ آپ امیر کے عہدے پر فائز تھے، عسکریت کے علاوہ فنِ شعر اور موسیقی میں بھی اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ۹۹ بتائی جاتی ہے۔ آپ نے فارسی اور ہندی کے ملاپ سے ریختہ لکھا۔ جو اردو کی شروعات میں اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کے ایک مشہور ریختہ کے تین اشعار ملاحظہ ہوں:

زحالِ مسکین مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چو زلف و روزِ وصلت چوں عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
چوں شمع سوزاں، چوں ذرہ حیراں زمہر آں مہ بکشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

آپ نے اگر چہ ہندی (اردو) میں پہیلیاں، ڈھکوسلے، مکرنی، انمل، گیت اور دوہے وغیرہ بھی لکھے لیکن حافظ محمود شیرانی نے آپ کی ایک ہندی (اردو) غزل پروفیسر سراج الدین آذر کی مملوکہ بیاض سے نقل کی ہے:

جب یار دیکھا نین بھر دل کی گئی چنتا اتر
ایسا نہیں کوئی عجب راکھے اسے سمجھائے کر

جب آنکھ سے اوجھل بھیا تڑپن لگا میرا جیا
حقا الٰہی کیا کیا آنسو چلے بھر لائے کر

توں تو ہمارا یار ہے تجھ پر ہمارا پیار ہے
تجھ دوستی بسیار ہے یک شب ملوتم آئے کر

جاناں طلب تیری کروں دیگر طلب کس کی کروں
تیری جو چنتا دل دھروں اک دن ملوتم آئے کر

خسرو کہے باتاں عجب دل میں نہ لاوے کچھ عجب
قدرت خدا کی ہے عجب جب جیودیا گل لائے کر

(پنجاب میں اردو، ص ۱۲۷)

آپ ۶۵۱ھ/ ۳ مارچ ۱۲۵۳ء کو پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے اور ۱۸ شوال ۷۲۵ھ/ ۲۷ ستمبر ۱۳۲۵ء کو دہلی میں وفات پائی۔

آپ کے معاصرین میں ہی نجم الدین امیر حسن علا سنجری بدایوانی (۶۵۳ھ/ ۱۲۵۵ء دہلی۔ ۷۳۶ھ/ ۱۳۳۵ء دولت آباد) بھی سلطان محمد تغلق کی فوج سے وابستہ تھے اور امیر کے مرتبے پر فائز تھے۔ محمد تغلق نے جب دکن پر حملہ کیا تو آپ اس کی فوج میں ایک دستے کی قیادت کررہے تھے۔

امیر حسن سنجری اگرچہ فارسی زبان کے عمدہ اور معروف شاعر تھے لیکن ریختہ (اردو) میں بھی آپ کہا۔ امیر خسرو کی درج بالا ہندی غزل کی زمین اور بحر میں آپ کی ایک غزل کے پانچ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر لحظہ آید دردلم دیکھوں اسے ٹک جائے کر
گویم حکایت ہجر خود باں صنم جیو لائے کر

جب تے سفر پی نے کیا تب تے غریب آوارہ ہوں
پی بیگ تے آنا کریں یا مجھ کو لیں بلوائے کر

آں سیم تن گوید مرا در کوئے ما آئے چرا
ماہی صفت تڑپھوں پڑا جو تک نہ دیکھوں جائے کر
بسیار گفتم ایں سخن اے دل بکس رغبت مکن
ان کی تباہی ات کٹھن بہوتوں کہے سمجھائے کر
بس حیلہ کر دن اے حسن بے جاں شدم از دم بدم
کیسے رہوں تجھ جیو بن تم لے گئے سنگ لائے کر

ایک اور حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ان مقامی شخصیات کے علاوہ بیرونی حملہ آوروں کے عساکر بھی ابھی تک اس زبان میں تبدیلی کا باعث بن رہے تھے۔ منگولوں نے ۱۲۸۶ء، ۱۲۹۶ء، ۱۲۹۹ء، ۱۳۰۳ء، ۱۳۰۵ء اور ۱۳۰۶ء میں ہندوستان پر کئی حملے کیے۔ ان حملوں میں وہ کبھی دریائے راوی تک اور کبھی دریائے ستلج تک اور کبھی دریائے سندھ تک قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے ہوئے پہنچتے اور واپس پلٹ جاتے۔ ان حملوں میں منگولوں نے جہاں ہندوستان کی ثقافتی زندگی میں ہلچل پیدا کی وہاں کچھ نہ کچھ لسانی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ یہ حملے خاندانِ غلاماں کو کمزور کرنے کا سبب بھی بنے اور لفظوں کے تبادلے کا بھی جس سے خلجی اور پھر تغلق خاندان نے فائدہ اٹھایا اور قابض ہو گئے۔

دورِ خلجیہ میں علاؤالدین خلجی کا زمانہ اردو زبان میں مزید ترقی کا سبب بنا۔ کیونکہ اس نے دکن اور گجرات کو بھی دہلی کے زیرِ نگیں کر لیا۔ اور شمالی ہند کی زبان وہاں بھی پہنچ گئی۔ لیکن علاؤالدین خلجی کے بعد کوئی خلجی حکمران سنبھل کر حکومت نہ کر سکا۔ محمد تغلق نے سلطنت دہلی سے نکل کر ”سندھ کے دارالحکومت ٹھٹھہ پر فوج کشی کی“ [۱۵۶] اور دوسری طرف دکن پر بھی عسکری برتری حاصل کر کے وہاں قبضہ جمایا۔ کچھ عرصہ بعد تغلقوں نے دہلی کو مراجعت کی لیکن وہ دکن کی ثقافت اور وہاں سے ابھرنے والی زبان کو ساتھ نہ لا سکے۔ ۱۳۳۳ء میں مشہور سیاح ابنِ بطوطہ ہندوستان آیا تو اس وقت تک یہاں اردو کا چلن عام ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سفرنامہ بزبانِ عربی لکھا ”جس میں بہت سے ایسے الفاظ شامل ہیں۔ جو ہندوستان میں بزبانِ اردو بولے جاتے تھے مثلاً پردہ، پروانہ، بارگاہ، ناخدا، ڈولہ، کہار، ٹٹو، منڈی وغیرہ کئی جگہوں پر اس نے الفاظ میں تبدیلی کر لی تھی مثلاً کھچڑی کو کشری، چودھری کو جوتری، جوگی کو جوگیہ اور کٹارہ کو قطارہ۔“ [۱۵۷]

فیروز تغلق نے فوجی نظم و نسق کو جاگیرداری نظام میں بدل دیا۔ اب ملکوں اور سرداروں کو فوجی دستے رکھنے کا اختیار تھا۔ ان دستوں کے اخراجات کے لیے انھیں مالیہ میں سے کچھ حصہ ملا کرتا تھا۔ اس نظام سے سپاہ کی دو اقسام ہوگئیں۔ ایک باقاعدہ فوج اور دوسری بے قاعدہ فوج۔ باقاعدہ فوج مستقل طور پر رکھی جاتی تھی اسے واجب کہا جاتا تھا بے قاعدہ فوج غیر مستقل سپاہ ہوتی تھی جسے غیر واجب کہا جاتا تھا۔۔۔ باپ کے مرنے کے بعد بیٹے کو فوجی خدمت کا حق حاصل تھا۔ اور ایسی خدمت موروثی سمجھی جاتی تھی۔[۱۵۸] اس کے عہد میں فوجی افسروں کے عہدوں کی ترتیب کچھ اس طرح تھی:

''سب سے اوپر خان، پھر ملک، اس کے بعد امیر، بعد ازاں اصفہلار اور آخر میں سپاہی۔۔۔ خان، ملک اور اصفہلار اپنے سپاہیوں کو گزارے کے لیے جائیدادیں نہیں دیتے جیسا کہ شام اور مصر میں دستور ہے بلکہ ان میں سے ہر افسر خود اپنے گزارے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ فوج اور سپاہیوں کو خود بادشاہ نوکر رکھتا تھا۔ اور شاہی خزانہ سے ان کو تنخواہ ملتی تھی۔ جو جائیداد خان، ملک، امیر یا اصفہلار کے لیے مقرر ہوتی ہے وہ اس کے ذاتی اخراجات کے لیے ہوتی ہے۔۔۔ خان کی کمان میں دس ہزار سوار ہوتے ہیں۔ ملک کی کمان میں ہزار، امیر کی کمان میں سو اور اصفہلار کی کمان میں اس سے کم۔''[۱۵۹]

تغلق شاہی کے دوران ہی ۱۳۹۸ء میں ایک بار پھر منگول درہ خیبر کے راستے برِصغیر پر حملہ آور ہوئے۔ اس بار فوجوں کی قیادت تیمور کے ہاتھ میں تھی۔ وہ آگے بڑھتا رہا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس نے تقریباً ایک ماہ تک قیام کیا۔ اس ایک ماہ میں فوجوں کے عمل دخل سے لین دین اور کاروبارِ حیات میں، مزید کچھ لسانی تبدیلیاں ہوئیں۔ منگول تو واپس چلے گئے لیکن خاندانِ تغلق کا خاتمہ ہوگیا۔ تیمور نے جاتے ہوئے دہلی کی حکومت سید خاندان کے سپرد کی۔

شمالی ہند میں اردو زبان اگرچہ آہستہ آہستہ اپنے سفر پر رواں تھی لیکن حکمرانوں نے چونکہ فارسی زبان کو اپنا رکھا تھا اور عوام صرف علاقائی زبانیں بولتے تھے۔ اس لیے خاص طور پر عسکری حوالے سے بظاہر ارتقائی عمل دکھائی نہیں دیا لیکن میل جول سے ایک تبدیلی بہر حال ہو رہی تھی جو تاریخ کا حصہ بننے والی تھی۔ گویا جب اجتماعی طور پر اسے دیکھتے ہیں تو دربارِ شاہیہ سے

منسلک تمام افراد وقت آنے پر عسکری خدمات بھی انجام دیتے تھے اور جب حکمرانِ وقت (سپہ سالار) کسی علاقے پر چڑھ دوڑتا یا میدانِ جنگ کا رخ کرتا تو وہ سب لوگ بھی اُس کی فوج کا حصہ ہوتے اور میدانِ جنگ میں دشمن سے نبرد آزما ہوتے۔

امیر تیمور نے اہلِ سادات میں سے خضر خان کو جب دہلی کے تخت پر بٹھایا تو چند سال کی حکمرانی کے بعد یہ خاندان ۱۴۵۰ء میں لودھیوں کے ہاتھوں اپنا تخت گنوا بیٹھا۔ بہلول لودھی ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اسے مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لودھیوں میں سکندر لودھی (وفات: نومبر ۱۵۱۷ء) صاحبِ علم و دانش تھا۔ اس کے دربار میں اہلِ دانش جمع رہتے تھے۔ وہ چونکہ خود بھی فارسی زبان کا شاعر تھا اس لیے زبان کے معاملے میں محتاط تھا۔ ''سکندر کے عہد میں ہندوؤں نے بھی فارسی لکھنا اور پڑھنا شروع کر دی اس سے پہلے ہندو فارسی نہیں پڑھتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستانی تصانیف بھی عربی اور فارسی میں منتقل کی جانے لگیں۔'' [۱۶۰] سکندر لودھی ہندوی زبان سے بخوبی واقف تھا اور اس کے دربار میں اس زبان میں اشعار پڑھے جاتے تھے۔ سکندر لودھی کی فوج میں شیخ جمال کنبوہ دہلوی کا ذکر ملتا ہے جو ایک شاعر تھے۔ سکندر اکثر اسے اپنے اشعار سنایا کرتا اور اس سے سنا کرتا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک رنگا رنگ شاعر تھا۔ اس سے اگرچہ ہندی کے اشعار ثابت نہیں لیکن فارسی میں ہندی طرز میں کہے ہوئے اشعار ملتے ہیں۔ ایک غزل بہت مشہور ہے:

طال شوقی لدے منازلکم ایہاالغائبون عن نظری
روز و شب مونسم خیالِ شماست فاسئلو! عن خیالکم خبری [۱۶۱]

لودھیوں کا عرصۂ حکومت بھی تقریباً پون صدی تک محدود رہا اور پھر ۱۵۲۶ء میں دوبارہ منگول/مغلیہ آ دھمکے اور بابر (۱۴ فروری ۱۴۸۳ء۔ ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء) نے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

سلاطینِ دہلی کے عہد میں الگ الگ صوبے بنائے گئے ہر صوبے کا حاکم صوبے دار کہلاتا تھا۔ وہ اپنی صوبائی فوج کا سپہ سالار بھی ہوتا تھا جو بیرونی دشمنوں سے جنگ کرنا، مرکز کو ضرورت پڑنے پر مدد کے لیے فوج بھیجنا یا اپنی کمان میں لے کر جانا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ ''عہدِ سلاطین میں فوجی ضروریات کے انتظام کے لیے الگ محکمہ تھا اس کے افسر اعلیٰ کو عارضِ ممالک کہتے تھے۔'' [۱۶۲] فوج کے تمام امور کی ذمے داری عارض کی تھی دہلی میں مقیم فوج کو حشمِ قلب

کہتے اور اس میں ایک خصوصی دستہ محافظ دستہ کہلاتا۔ فوج کے تین حصے ہوتے۔ پیادہ فوج، رسالہ یا اسوار فوج، جنگی ہاتھی۔

چونکہ نظامِ حکومت باجگزار نوعیت کا تھا اور سردار یا راجے، مہاراجے اس نظام کو چلا رہے تھے اس لیے وہ سردار یا راجہ اپنی فوج کا خود سپہ سالار ہوتا تھا جس کی فوج میں ہاتھی، رتھ سوار اور پیدل سپاہی ہوتے۔ سلاطین کی فوج میں ''عارض الملک کے نیچے عارضِ سپاہ بھی تھا۔ وہ فوج کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا اور جاگیردار اور باجگزار امراء جو گھوڑے شاہی فوج کے لیے تیار رکھتے تھے ان کا وقتاً فوقتاً معائنہ کرتا۔ اس عہدے دار کو رواتِ عرض بھی کہتے تھے۔''[۱۶۳] صوبیدار بھی جنگ کے موقع پر شاہی فوج کی کمک کے لیے اپنی اپنی فوجیں جن کی تعداد اکثر مقرر کر دی جاتی تھی بھیجنے کے روادار تھے۔ ''سپہ سالار کو عموماً مقدم کہتے تھے۔ فوجی افسروں کے مختلف مراتب نہ تھے۔''[۱۶۴] نیز تاریخِ مرکزِ ہند کے صفحہ ۳۶۵ کے مطابق ''اصطبل کے نگران کو امیر آخور کہتے تھے۔ پیادہ فوج کے سپاہی کو پاٹک کہتے۔ وہ تیر، تلوار، خنجر، نیزہ اور ڈھال سے مسلح ہوتے تھے۔ شاہی محل میں پہریدار بھی پاٹک ہی ہوا کرتے تھے۔'' فوج ہر وقت تیار رہتی تھی۔ اور جس مرتبے کا سپہ سالار حرکت کرتا اس کے درباری بھی تقریباً ساتھ ہی ہوتے۔ گویا وہی درباری جن میں مختلف مکتبۂ فکر، مختلف ذمہ داریوں کے لوگ، دانشور، شاعر اور ادیب وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ جنگوں میں باقاعدہ جنگی خدمات انجام دیتے اور وہ لوگ بھی فوج کا حصہ ہوتے۔ یوں یہ عسکری نظام اور عسکری حرکت و عمل اس زبان کے فروغ اور ارتقاء میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ اردو زبان کی اس خدمت میں اگرچہ فقہا، علماء اور مبلّغین و دیگر لوگ بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن چونکہ وہ لوگ میرے موضوع کا حصہ نہیں اس لیے ان سے اجتناب ضروری ہے۔

بابر نے جب ہندوستان کے ایک وسیع و عریض علاقے پر اپنا تسلّط قائم کر لیا تو اس نے اپنی یادداشتیں لکھنا شروع کیں جو تزکِ بابری کے نام سے شائع ہوئیں۔ جس میں اس نے لفظ اردو کئی مقامات پر استعمال کیا۔ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ پہلی بار لفظ اردو سے آشنا ہوئے۔ بابر نے یہ لفظ لشکر کے معنی میں استعمال کیا۔ جس سے تمام ماہرینِ لسانیات متفق ہیں۔ بابر اور اس کے ہمراہی نسلاً ترک تھے اور ترکی زبان بولتے تھے چنانچہ تزکِ بابری بھی ترکی زبان میں لکھی گئی۔ جس سے یہ اندازہ لگانا یا اسے تسلیم کرنا کوئی مشکل نہیں کہ اردو ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اس آپ بیتی

کے علاوہ بابر کا ایک مختصر دیوان بھی ترکی زبان میں موجود ہے۔ بابر اور اس کے لشکریوں نے جہاں ہندوستان کی فضا کو اور یہاں کی تہذیب کو دل وجان سے اپنایا وہیں انھوں نے ترکی زبان کے کئی الفاظ بھی یہاں کی مقامی زبان میں شامل کیے جو اردو کا حصہ بنے مثلاً بہادر، نوکر، باورچی، جرگہ، چاقو، خنجر، قینچی، تسمہ، قابو، بابا، خصم، خاتون، خان، پلاؤ، یخنی وغیرہ۔[۱۶۵]

مقامی زبان کے اثرات کے حوالے سے تاریخ میں یہ واقع بھی رقم ہے کہ بابر کو چونکہ دولت خان لودھی نے ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی جسے بعد میں پشیمانی ہوئی اور بابر سے منحرف ہوگیا۔ فتح کے بعد جب اسے بابر کے سامنے لایا گیا تو ان کے درمیان ''ایک مکالمہ ہوا جو ہندوستانی ترجمان کے ذریعے ہوا کہ لودھی امیر فارسی زبان سے بالکل ناآشنا تھا۔۔۔ یہ ہندی قطعہ فاتح کو پڑھ کر سنایا گیا۔

نو سے اوپر تھا بتیسا (۹۳۲) پانی پت میں بھارت دیسا
اٹھیں (۸ دن) رجب سکروارا بابر جتیا ابراہیم ہارا'' [۱۶۶]

بابر نے اپنے ایک سالار (سردار) کی شکست پر اسے سرزنش نہیں کی بلکہ معاف کردیا اور اس معافی کی وجہ لکھی کہ ''سردار کی پسپائی قابلِ عفو ہے۔ غیر زمین، غیر کفو ہی نہیں بلکہ غیر زبان سے مقابلہ، نہ ہم یہاں کے بول سمجھ سکتے ہیں اور نہ وہ ہماری زبان جانتے ہیں۔''[۱۶۷] ان حالات کو سمجھتے ہوئے بابر یہاں کے ماحول میں ڈھلنے لگا اس نے چونکہ اس خطے میں رہنا تھا اور حکومت کرنی تھی۔ سو اس نے خود کو اس ماحول میں ضم کردیا۔ وہ ایک باشعور حکمران تھا اس پر مستزاد شاعری اور ادب سے اس کا ربط۔ وہ دوسری زبانوں کا نہ صرف احترام کرتا تھا بلکہ انھیں سیکھنے اور سمجھنے کا شوقین بھی تھا۔ لہٰذا اس نے جلد ہی مقامی زبانوں کے الفاظ سیکھ لیے جس کا اظہار تزکِ بابری میں ہندوستانی زبان کے لفظوں کے استعمال سے ہوتا ہے۔

نصیر خان خیالؔ اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> ''وہ ہمہ گیر بادشاہ اسی پر بس نہ کرتا بلکہ پیاری زبان کو خلعتِ نظم بھی بخشتا تھا۔ اس کی رنگین طبیعت نے ایک مرتبہ اپنے تخیلات وجذبات کے پتلے کو ترکی خرقہ اور ہندی جامہ پہنایا۔ اور شوخیوں کے ساتھ اسے محفل میں یوں جلوہ دیا۔''

مجکا نہ ہوا کج ہوس مانک و موتی
فقر اہلغیہ بس بولغوسیدو پانی وروتی‘[۱۶۸]

ظہیر الدین بابر از بیک کلاسیک ادب کا مشہور ترین نمائندہ ہے۔ اگرچہ وہ ساری زندگی جنگ و جدال میں مصروف رہا لیکن پھر بھی تزکِ بابری (بابر نامہ) کے علاوہ خوبصورت ترین اور نفیس غزلوں اور رباعیات پر مبنی ایک دیوان (ترکی) ایک رسالہ عروض اور ایک کتاب 'مبین' ادبی اثاثہ چھوڑا ہے۔ بابر نے اپنی تصانیف میں ہندی زبان کے کئی الفاظ استعمال کیے ہیں جیسے:

''مبین، میں لفظ کروہ استعمال کیا ہے پنجابی میں ہم کوہ فاصلے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں کوس ہے اور یہ لفظ تزک بابری میں ۱۱۵ بار استعمال ہوا ہے۔ ہمارے اندازے کے مطابق بابر نامہ میں ۴۰۹ ہندی (اُردو) الفاظ موجود ہیں۔ یہ ۴۰۹ الفاظ، بابر نامہ میں کل ملا کر ۲۴۴۵ بار ملتے ہیں۔ مثلاً نول، بیر، تاڑ، لاک، لاکھ، کروڑ وغیرہ۔ ظہیر الدین بابر کی تصانیف میں ہندی اردو کے سینکڑوں الفاظ کا موجود ہونا ہندی، اردو زبان کی تاریخ لکھنے کے لیے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔''[۱۶۹]

بابر کی لکھائی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بہت عمدہ تھی اور وہ بڑی احتیاط سے، سوچ سمجھ کر اور ٹھہر ٹھہر کر لکھا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ ہمایوں کو بھی یہی کہا کرتا کہ صاف لکھا کرو۔ کلام الملوک ملوک الکلام، یعنی بادشاہوں کی زبان زبانوں کی بادشاہ ہوتی ہے۔ ملا بدایونی لکھتا ہے کہ خطِ بابری میں اس نے قرآن مجید لکھا اور یہ نادر نسخہ مکہ بھجوایا۔[۱۷۰] بابر ہندوستان پر تسلط کے صرف چار سال بعد زندہ رہا حکومت ابھی اتنی مضبوط نہیں ہوئی تھی کہ یہ بوجھ ہمایوں (۶ مارچ ۱۵۰۸ء۔ ۲۸ جنوری ۱۵۵۶ء) کے کندھوں پر آ پڑا۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ ہمایوں کا گھر کے بھیدی شیر شاہ سوری سے واسطہ پڑا۔ جس نے دس سال کے عرصے میں یہ لنکا ڈھادی اور ہمایوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ یہاں تک کہ اکبر کی پیدائش بھی اسی بھاگم بھاگ میں ہوئی۔ ہمایوں اگرچہ ادبی ذوق رکھتا تھا اور بذاتِ خود شعر کہتا تھا۔ لیکن اسے ہندی (اردو) زبان کی طرف بہتری کے لیے توجہ کا موقع نہ مل سکا۔ شیر شاہ سوری (فرید خان پ ۱۴۷۲ء کے لگ بھگ، و ۲۲ مئی ۱۵۴۵ء) نے ۱۵۴۰ء میں ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کی۔ دو سال تک وہ ہمایوں کے پیچھے رہا۔ اور ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ عدم سے

بلاوا آ گیا لیکن ہمایوں اور شیر شاہ سوری کے عہد میں اتنا ضرور ہوا کہ ان کے ہمراہی عسکریوں کو کئی علاقوں میں قیام کرنا پڑا۔ ہمایوں کے ساتھ اگرچہ تھوڑے سے لوگ تھے لیکن وہ دہلی سے جہلم، خوشاب، بھکر، ٹھٹھہ اور عمرکوٹ تک گئے۔ اور پھر ایران کی طرف چلے گئے تو انھیں مختلف علاقوں میں اپنے الفاظ دینے اور ان کے کئی الفاظ لینے کا موقع ملا۔ جس سے زبان میں تبدیلی واضح ہے۔ شیر شاہ سوری بھی اس کے پیچھے رہتاس اور ایک روایت کے مطابق خوشاب کے علاقے تک آیا اور اسی طرح لسانی اثرات چھوڑتا اور سمیٹتا ہوا واپس پلٹا۔ شیر شاہ کے دورِ حکومت میں شیخ عیسیٰ مشوانی کے کچھ اشعار تبدیل پذیر ہوتی زبان میں ملتے ہیں۔ جو شیر شاہ سوری کے عہد کا سپاہی اور شاعر ہے یہ اشعار ہند کو اردو میں ہیں:

کلے ازلی جو گیا لکھ — ان کا دن نہ کی جے دکھ
گھر بیٹھے دے دیسی رام — جو وہ لکھیو تیرے نام
جو تو کرسی اللہ یقین — کامل ہوسی تیرا دین [۱۷۱]

شیر شاہ سوری نے اتنی کم مدت میں فوجی نظام میں بھی قدرے تبدیلی کی:

> ''اس نے فوج کو سلطنت کے مختلف حصوں میں بڑی بڑی چھاؤنیوں میں رکھا تھا۔ ہر ایک چھاؤنی کا افسرِ اعلیٰ فوجدار کہلاتا تھا۔ تمام فوج مرکزی حکومت کے ماتحت تھی۔ مستقل فوج کے علاوہ سردار بھی اپنی فوج رکھا کرتے تھے مگر ہر ایک سردار کی فوج کی تعداد مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر کی جاتی تھی۔ شیر شاہ سے پہلے فوج صوبیداروں کے تحت ہوتی تھی اگر سلطان اور صوبے دار میں جھگڑا ہو جاتا تو فوج صوبیدار کی طرف داری کرتی۔ شیر شاہ نے فوج کو مرکزی حکومت کے ماتحت کر دیا۔ اس نے علاؤالدین خلجی کی طرح نظام جاگیرداری کو ختم کر دیا اور بڑے بڑے فوجی سرداروں کو بھی تنخواہ دینے کا سلسلہ جاری کیا۔'' [۱۷۲]

نصیرالدین ہمایوں ۱۵۵۰ء میں واپس آیا تو اس کی مدد کے لیے اس کے ہمراہ ایرانی فوج تھی۔ ہمایوں کے برِصغیر پر دوبارہ قابض ہونے سے ایک تو مسلک کا بہت بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ دوسرا فارسی زبان کو پھر سے داخلے کا موقع ملا۔ لیکن واپسی کے بعد ہمایوں کو بھی کم عرصہ ملا جس میں وہ

نظامِ مملکت کو مزید بہتر نہ کرسکا۔ ہمایوں کو علم وادب ورثے میں ملا تھا۔ وہ ترکی اور فارسی زبانوں پر خاصی دسترس رکھتا تھا۔ علمِ نجوم، فلسفہ اور ریاضی کا بھی عالم تھا۔ وہ علماء کی صحبت پسند کرتا تھا۔ مطالعہ کا بیحد شوقین تھا۔ علم پرور بھی تھا۔ اس کا اپنا ذاتی دارالمطالعہ بھی تھا۔ اس نے شاہی کتب خانے کی بھی توسیع کی لیکن ہندی (اردو) کی طرف وہ شاید زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ وہ فارسی اور ترکی میں شعر بھی کہتا تھا لیکن ہندی میں اس کا کوئی فقرہ یا کلمہ یا شعر میری نظری سے نہیں گزرا۔

ہمایوں کے بعد اکبر [۱۷۴۳] نے حکومت کا نظم ونسق سنبھالا۔ اکبر کی پیدائش چونکہ اسی خطۂ ہند و پاک کی تھی۔ مزید یہ کہ کم عمری میں ہی اس پر تخت وتاج کی ذمہ داری آن پڑی تھی۔ اس کا نقصان اسے یہ تو ہوا کہ مکتبی تعلیم حاصل نہ کرسکا۔ لیکن اس نے دنیا کا مشاہدہ کرنے اور اسے اندر کی آنکھ سے دیکھ کر باطنی مطالعہ کرنے میں کوئی کمی نہ رہنے دی۔

سید فصیح اللہ کے بقول:

''جب وہ نچنت ہو کر بیٹھا تو ادھر بھی متوجہ ہوا۔ بکر ماجیت کا وقت یاد آیا اور اپنے دربار کو بھی نورتن سے سجایا۔ چار ایوان کھڑا کیا۔ اور وہاں حکمت وادب کا درس دیا۔ اس مدرسہ سے چھٹی ملتی تو فارسی ہندی کتاب کھلتی اور دونوں زبانوں کا میل شروع ہو جاتا۔ کبھی مہابھارت کا میدان نقیب خان کے سپرد ہوتا اور اسے رزم نامہ کا خطاب ملتا اور کبھی رامائن کی کتھا کہی جاتی اور کشن، گنگا دھر، اور مہیش کے ساتھ ملائے بدایوانی کی زبان صاف کی جاتی۔ امیر حمزہ کی داستان ختم ہوتی تو ہری بنس کا قصہ چھڑتا اور ملا شری کرشن جی کا نام جپتا۔ آج سنگاسن بتیسی کی پتلیاں ناچتیں، حکمت کا رنگ چھیڑتیں اور خرد افزا سمجھی جاتیں تو کل کلیلہ دمنہ کے طلسمی حیوان گویا ہوتے، چٹکلے لطیفے کہتے اور عیار دانش بنتے، کبھی لیلا و مجنوں، عربی اور شیریں وخسرو فارسی بدیسی سمجھ کر محفل سے اٹھائے جاتے اور ان کی جگہ سدیشی نل ودمن لیتے۔ زلیخا کی ملک رانی دروپدی کو ملتی اور زبیدہ کی حرم سرا سیتا جی کے نیگ لگتی۔ فیضی مؤدب ہو کر لیلاوتی کا حساب پیش کرتا تو مکمّل خان دوزانوں ہوتا جگ کی شکل و ہیئت بتاتا۔ سرہندی حاجی ابراہیم آداب بجالا کر آتھر وید اکی حکمت سناتا

اور خانِ خاناں عبدالرحیم دعائیں دے کر جوتن سے نیک لگن اور شبھ گھڑی بتاتا۔

غرض یہ چرچے اور قصے مہینوں میں برسوتی رہے۔''[۱۷۴]

ان محافل اور صحبتوں سے جلال الدین اکبر نے بہت کچھ سیکھا۔ علم، حکمت، مذاہب، سیاست، عسکریت گویا کہ سماعت کے ذریعے ذہن میں وہ سب کچھ اتار لیا جو شاید مکتب اور کتب بینی سے حاصل نہ ہو پاتا۔ یوں اکبر نے اپنی دھرتی کی زبان اور اس کے ساتھ دیگر زبانوں کے اختلاط سے سفر پذیر زبان کو ایک نئی طاقت دی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ہندو عورتوں کی شادی اور ہندو معاشرے کے ساتھ ملاپ نے بھی اردو کی سلاست اور سمجھنے کی صلاحیت میں اضافہ کیا۔ اس سے اکبر نے شعر کو پرکھنے کا سلیقہ اور شعر کہنے کا گر بھی حاصل کیا۔ ایک موقعہ پر طالب آملی نے ایک رباعی پڑھی جس کا تیسرا مصرع ''اور فت بہ دنبالہ وعمر برفت'' پر اکبر نے کہا دنبالہ کھٹکتا ہے اور پھر اصلاح دی ''اور فت ور فتنش مرا عمر برفت'' چونکہ دربار میں ہندی (اردو) اور سنسکرت وغیرہ بھی بولی جاتی تھی جسے اکبر نے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ کر لیا۔ اکبر نے جب شعر کہنا شروع کیا تو اکبر ساہی تخلّص اختیار کیا۔

جا کر جس ہے جگت میں جگت سرا ہے جاہی
تا کو جنم سپھل ہے کہتا ہے اکبر ساہی
پیتھا لاسوں مجلس گئی تان سین سوں راگ
ہنسی و رمی و بولی گیو بیر برسوں ساتھ'' [۱۷۵]

اکبر کی محفل میں راجہ مان سنگھ اور بیربر کی صحبتوں سے اردو کے چٹکلے بھی چھوٹتے۔ وہ اُردو میں بات چیت کرتے تو دربار کے تمام لوگ محظوظ ہوتے اور ان کے ساتھ اسی زبان میں بات کرتے۔ کہا جاتا کہ ابوالفضل کو سلیم نے قتل کروایا تھا لہٰذا اس واقعہ کے بعد وہ بادشاہ کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا آخر ملاقات کے لیے بادشاہ کے حضور درخواست پیش کی تو اس نے درخواست میں یہ رباعی تحریر کی۔

پوچھی جو گھڑی مجھ سے براہِ عادت — تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت — ساعت کا بہانہ نہیں خوش ہر ساعت''[۱۷۶]

''مہاراجہ مان سنگھ کو اکبر نے جب اپنے اونچیوں کے ٹڈی دل کے ساتھ
کابل پر چڑھائی کے لیے بھیجا تو مہاراجہ چلے اور چلتے چلتے اٹک کے پنگھٹ

پر پہنچ کر اٹک گئے۔ کسی ندی کو پار کرنا دھرم مہا پاپ سمجھتا ہے۔ اس لیے
مہاراجہ پاپ سے بچنے کے لیے اٹک پر اٹکے رہے۔ اور آگے نہ بڑھ سکے۔
اکبر نے جب اس کی سن گن پائی تو یہ دوہا لکھ بھیجا۔

بسے بھومی گوپال کی یاد میں الک کہا
جا کے من مان اٹک ہے سوئی اٹک رہا

مہاراجہ یہ دوہا دیکھ کر پھر گھڑی بھر نہ ٹھہر سکے اور اٹک پار کر کے آگے
بڑھے۔"[۱۷۷]

دربارِ اکبری کے نورتن بھی دربار میں ہندی (اردو) میں ہی گفتگو کرتے مہابلی کے عہد میں ہندی (اردو) زبان پھلنے پھولنے لگی۔ اونچے اونچے گھرانے اس کے رسیا ہو گئے۔ اکبر کے راج کے عبدالرحیم خانخاناں، فتح اللہ شیرازی، شیخ مبارک، شیخ ابوالفضل، شیخ عبدالقادر، شیخ سلطان، نقیب خان، حاجی ابراہیم، مکمل خان" وغیرہ۔[۱۷۸] یہ تمام لوگ درباری تھے ان پر لازم تھا کہ جنگ کے دوران رزم گاہ میں بھی اپنے جوہر دکھائیں۔ اس زمانے میں گھوڑوں، ہاتھیوں اور ہتھیاروں کے نام بھی ہندی رکھے گئے۔ جو چیزیں ہندوستان کی پیداوار تھیں ان کے نام قدرتی طور پر ہندی تھے وہ سب زبانوں پر چڑھ گئے اور فارسی عبارتوں میں بھی ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کیے جانے لگے۔ مثلاً "جھروکہ، درشن، پھول، کٹار، تلوار، گھوڑا، ہاتھی، پالکی، جھالر، کہار، ڈاک، چوکی، پٹواری، رائے، راجہ، مہاراجہ، چودھری، پہر، دوپہر، گھڑی، گھڑیال، ڈالی، گھاٹ، بیوپاری"[۱۷۹] وغیرہ اور اس طرح کے سینکڑوں الفاظ اکبر کے دور میں درباری زبان کا حصہ بنے جو اس وقت سرکاری زبان تھی۔

اکبر کے عہد تک اور خاص کر اکبر کے عہد میں اس زبان کی بنیاد اٹھائی جا چکی تھیں۔ ایک "نئی تہذیب جس کی موسیقی، زبان، طرزِ لباس وغیرہ میں ہندوی اور عربی ایرانی کلچر مل کر ایک ہو گئے تھے۔۔۔ اکبر ایک ایسے کلچر کو پروان چڑھانا چاہتا تھا جسے صحیح معنی میں تیسرا کلچر کہا جا سکے۔"[۱۸۰]

اکبر کے دور میں شمال مغربی علاقہ (موجودہ صوبہ خیبر پختونخواہ) میں ایک مذہبی تحریک نے زور پکڑا۔ یہ لوگ اگرچہ باقاعدہ فوجی نہیں تھے لیکن مجاہد تھے اور میدانِ جنگ میں مجاہدین کو عسکریت سے خارج نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ اکبر کے دینِ اکبری کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے

جن کی قیادت پیر روشان/ اروخان (م۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء) کر رہے تھے۔ پیر روشان کی سب سے اہم تصنیف خیر البیان ہے اس میں بیک وقت چار زبانوں میں مطالب بیان کیے گئے ہیں۔ پہلے عربی، فارسی میں اور اس کے بعد پشتو، اردو میں۔'' [۱۸۱] پیر روشان کا مرکز سے اس قدر دور بیٹھ کر اس زبان میں لکھنے کی وجہ یہی ذہن میں آتی ہے کہ اس وقت تک یہ زبان برصغیر پاک و ہند کے دور دراز علاقوں میں بولی، پڑھی، لکھی اور سمجھی جاتی تھی۔ پیر روشان کی تحریر کا نمونہ ملاحظہ ہو:

''اے بایزید! لکھ وہ اکھر جسے سب جیب سہن جڑتھیں۔ اس کارن جے نفع پاویں آدمیاں کچھ کا۔ میں ناہیں جانتا بن قرآن کے اکھر اے سبحان۔ اے بایزید! لکھنا اکھر کا تجھے ہے۔ دکھلاونا اور سکھلاونا مجھے ہے۔ لکھ میرے فرمان سہن، جیوں اکھر قرآن کے پھن کے پھن۔ لکھ اکھر اوپر تکنا کے جزم اور نشان، جیو اکھر پچھانن آدمیاں لکھ کوئی اکھر چار چار عیاں در حال سکھنے جے پڑھن آدمیاں۔'' [۱۸۲]

گویا زبان کا ایک قافلہ بن چکا تھا اور وہ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ زبان ابھی تک کوئی نام نہیں پا سکی تھی۔ کہیں ہندی، کہیں ہندوی اور کہیں اپنے علاقے کی نسبت سے اسی کے نام سے موسوم ہو کر بولی جاتی تھی۔ شاعری میں اسے ریختہ بھی کہا جاتا تھا۔ کیونکہ کئی ایسے نمونے بابا فرید گنج شکر اور امیر خسرو سے لے کر اکبر کے دور تک سامنے آ چکے تھے۔ جن میں ہندی اور عربی یا فارسی کے الفاظ کو ملا کر شعر کہا گیا۔ اور یہ بھی اسی نومولود زبان کا حصہ ہے۔ اکبر کے درباریوں میں سے بہرام سقہ بخاری کی ایک غزل کا مطلع اور مقطع ملاحظہ ہو:

باز ہندو بچۂ قصد دلم دھرتی ہے ۔۔۔ کوچہ نہیں جانوازیں خستہ کی کرتی ہے
چپ کرائے دل شدہ سقہ زعمِ یار منال ۔۔۔ گر جفا رفت بہ جانِ تو یہاں کرتی ہے [۱۸۳]

اکبر ہی کے ایک اور درباری ملا نوری کا ایک شعر جس کا ایک مصرع خالص ٹکسالی فارسی اور دوسرا مصرع خالص بامحاورہ اردو میں ہے۔ یاد رہے کہ یہ درباری اکبر کی فوج کا حصہ تھے اور اپنے اپنے مقام پر منصب دار تھے۔

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد
بے چارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے [۱۸۴]

میر منشی کا عہدہ اگر چہ وزارت تھا لیکن وزراء کو بھی بادشاہ کے ساتھ مہمات میں سفر کرنا اور حصہ لینا پڑتا تھا اکبر کے دربار میں عشقی خان عشقی میر منشی کے عہدے پر فائز تھا۔ اس نے بھی ریختہ میں طبع آزمائی کی۔ سرد و گرم زمانہ اس کا فارسی قصیدہ ہے۔ اس میں ایک تاجک بیوی جب ایک ہندوستانی بیوی سے آمنے سامنے ہوتی ہے۔ تو وہ کہتی ہے:

زنِ ہندی زیک طرف گوید   ہوں تری لونڈی تو مرا خوندگار
تم جو مجھ کو پیار کرتے ہو   میں بھی کرتی ہوں تمہارا پیار
اپنے کوٹھے پہ میں بچھاؤں پلنگ   اوس اوپر لیت جاؤں پاؤں پسار [۱۸۵]

اس قصیدہ میں بہت سارے اشعار ہیں جو ریختہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ گویا اکبر کے دور میں یہ زبان جو ابھی تک اپنا مستقل نام نہیں پاسکی تھی ہر پیمانے پر بولی اور لکھی جارہی تھی اکبری شہزادوں اور شہزادیوں کی یہ مادری زبان تھی" دانیال کا روزمرہ بھی یہی تھا اور وہ ہندی داں ہی نہیں بلکہ بھاشا کا شاعر بھی تھا۔"[۱۸۶]

اکبر نے اپنی فوج کو پانچ اقسام میں تقسیم کیا جس میں منصب داری فوج، احدی فوج، داخلی فوج، مستقل فوج، باجگزار راجاؤں کی فوج۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ:

"نظامِ منصب داری میں اکبر نے ۳۳ درجے مقرر کیے۔ جس شخص کو کوئی منصب دیا جاتا اسے منصب دار کہتے تھے چھوٹے سے چھوٹا منصب ۱۰ کا تھا۔ اور سب سے بڑا منصب ۱۰ ہزار کا تھا۔ ۱۰۰ سے ۴۰۰ تک منصب رکھنے والوں کو امیر الامراء کہا جاتا تھا۔ ۷۰۰۰ سے اوپر کے منصب عام طور پر شہزادوں کے لیے مخصوص تھے۔"[۱۸۷]

مزید تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ یہ منصب اکبر خود ہی عطا کرتا تھا۔ احدی فوج بادشاہ کے ذاتی محافظ ہوتے تھے۔ ان کے پاس اعلیٰ نسل کے گھوڑے ہوتے اور یہ سب کے سب شہنشاہ کے زیادہ وفادار ہوتے تھے۔ داخلی فوج میں سرکار کی طرف سے سپاہی بھرتی کیے جاتے تھے جنھیں شاہی خزانے سے تنخواہ دی جاتی۔ "اکبر کی مستقل فوج میں پانچ شعبے تھے۔ پیدل فوج، توپ خانہ، گھوڑا سوار، بحری جہاز اور جنگی ہاتھی۔"[۱۸۸] باجگزاروں کی فوج وقت پڑنے پر باجگزار راجاؤں سے طلب کی جاسکتی تھی۔

اکبر کے بعد شاہزادہ محمد سلطان سلیم (۳۰/ اگست ۱۵۶۹ء-۱۲۹ اکتوبر ۱۶۲۷ء) نے جہانگیر کے لقب سے ہندوستان کے تختِ حکومت کو سنبھالا۔ چونکہ گھر کا سارا ماحول ہندی تھا اور ہندی زبان ہی اکثر بولی جاتی تھی۔ اس لیے وہ اس ماحول کو اپنانے میں پس و پیش نہ کر سکا۔ نیز اسے فارسی، ترکی اور ہندی ہر سہ زبانوں کی تعلیم دی گئی۔ ادب سے شوق کچھ ورثے میں ملا' کچھ تعلیم نے شعور دیا اور رہی سہی کسر جب نور جہان سے شادی ہوئی تو پوری ہو گئی۔ نور جہان خود بھی ایک اچھی شاعرہ تھی فارسی کی ایک نابغہ اور اردو میں بھی شعر کہتی تھی۔ لہٰذا جہانگیر کی نور جہان سے قربت نے اسے بھی نکھار دیا جس کا ایک ثبوت تو تزکِ جہانگیری ہے۔ جس میں اس نے ہندی کے بہت سے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ نیز یہ شعر اس سے منسوب ہے۔

پچ ہزارا کنکاں بھلیاں ، دھنی کھوب گائیں

سور سکیرتی گھوڑ بھلے اور ہشت نگر کے دھائیں[۱۸۰]

بابر کے بعد جہاں اکبر نے شاہی سکوں پر اردو کا لفظ لکھا اور اسے لشکر کے معنوں میں لیا وہیں جہانگیر نے بھی اپنے نام کے سکے جو جاری کیے ان پر اردو کا لفظ کندہ کرایا۔ اس نے دلی سے کشمیر کی طرف سفر کرتے ہوئے جو سکہ بنوایا۔ اس پر لکھا تھا:

بادِ رواں تا کہ بود مہر و ماہ

سکۂ اردوئے جہانگیر شاہ

''تزکِ جہانگیری میں جہانگیر ایک ایسے صناع کے روپ میں سامنے آتا ہے جس کا مقصد ارضِ ہند کی ہر کجی کو دور کرنا اور اسے خوبصورتی اور رعنائی عطا کرنا ہے۔''[۱۹۰]

ابوالفضل کے قاتل بیر سنگھ بندیلہ جو جہانگیر کا منصب دار تھا کے حالاتِ زندگی کیشو رداس نے عہدِ جہانگیری میں ہی لکھے۔ کیشو رداس بھی جہانگیر کی فوج میں شامل تھا۔ بیر سنگھ دیو چرتر کے نام سے یہ کتاب منظرِ عام پر آئی۔ ''اس کتاب میں سنسکرت کی بہتات ہے نیز آگرہ و متھرا کے گردونواح میں بولی جانے والی زبان اور جمنا کے جنوب کی بندیل کھنڈی بولی کے پیچ پیچ کی ہے۔''[۱۹۱] اسی مصنّف کی انہی زبانوں میں جسے ہندی کہا جاتا تھا کہ 'رام چندریکا'، 'رسک پریا' اور 'جہانگیر چندریکا' جو جہانگیر کے حالاتِ زندگی پر ہے بھی تاریخ کا حصہ ہیں۔

بنی پرشاد کے مطابق:

''راجہ مان سنگھ کا ایک نہایت ہی قیمتی روزنامچہ جے پور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔لیکن علم کے متلاشی کو اس کے دیکھنے کی اجازت نہیں۔''[۱۹۲]

نورالدین محمد جہانگیر کے بعد شہزادہ خرم (۵ جنوری ۱۵۹۲ء۔۲۲ جنوری ۱۶۶۶ء) شہاب الدین محمد شاہ جہان کے نام سے تخت پر براجمان ہوا تو اسے جہاں عسکری لحاظ سے اپنی سوتیلی والدہ نور جہاں جو جہانگیر کے دور میں مملکت کی کرتا دھرتا تھی اور اس کے آلہ کار اپنے سوتیلے بھائی شہریار کی مخالفت کا سامنا تھا اور مختلف بغاوتوں سے نمٹنا تھا وہیں لسانی طور پر اسے ایک مضبوط روایت بھی ملی تھی جسے لے کر اسے آگے بڑھنا اور بڑھانا تھا۔خرم اس لسانی روایت میں پیدا ہوا، پلا اور بڑھا۔اس حوالے سے اس کے کندھوں کا بوجھ اپنے پیشرؤں کی نسبت کچھ زیادہ تھا کہ ان کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری کرے اور اس کی پہچان کرائے۔شاید اسی لیے اس نے تمام مخالفتوں، بغاوتوں اور مخالف تحریکوں کے باوجود علم وادب کی قدردانی کی۔اس نے علماء، ادباء، شعرا، موسیقاروں، خوشنویسوں اور مصوروں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا اور علم وادب، آرٹ اور موسیقی کی سرپرستی کی۔اس کے عہد میں بہت سی کتابوں کے تراجم ہوئے۔تاریخ کی کئی کتب تصنیف ہوئیں۔نیز اس کے فنونِ لطیفہ سے محبّت کی شاہکار اس کی تعمیر کردہ عمارتیں اور باغات آج کئی سو سال گزرنے کے باوجود زمین کی چھاتی پر پرشکوہ انداز میں سر اٹھا کر کھڑے نظر آتے ہیں۔شاہ جہان کی فوج میں بے شمار شعراء وادباء موجود تھے۔لیکن ان میں زیادہ تر فارسی زبان کی روایت کو اپنائے ہوئے تھے اور جو ہندی اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے ان کے نام سامنے نہیں آسکے۔

۵۔زبان کو نام ملتا ہے

''شاہجہان کو زبان اردو پر وہی حق دعویٰ ہے جو کسی صناع کو اپنی صنعت و کاریگری پر ہوا کرتا ہے۔اور جب تک یہاں کی یہ دو بڑی قومیں ہندو، مسلمان زندہ ہیں اپنے اس ہندی شہنشاہ کی اس بے مثل صناعی اور اپنی قومیت کی نشانی کو یاد کر کے اس کی روح کو خوش کرتی رہیں گی۔''[۱۹۳]

یہ اتنا بڑا دعویٰ آخر کیوں کیا گیا؟ جب کہ شاہ جہان کی تو کوئی تحریر بھی سامنے نہیں آئی۔

لوگ یہ جانتے ہیں کہ تیمور، بابر اور جہانگیر کی طرح، شاہ جہاں نامہ اس کی تحریر نہیں بلکہ محمد صالح کنبوہ کی ہے۔ ان کے ذہنوں میں اس سوال کا اٹھنا بجا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ علم و ادب کا دلدادہ تھا۔ اس کا دور ہندی زبان و ادب کا شاندار عہد سمجھا جاتا ہے۔ وہ ہندی بولتا، ہندی موسیقی کا رسیا اور ہندی شعراء کا سرپرست تھا۔ لفظ اردو ترکی زبان کا ہے جس سے مراد خیمہ بازار، لشکر، محل، حرم گاہ اور قلعہ ہیں جب کہ کچھ دیگر زبانوں والے اسے اپنی زبان کا لفظ کہتے ہیں۔ اور اس سے قدرے مختلف معنی لیکن لشکر کے مفہوم میں ہی استعمال کرتے ہیں۔ تزکِ بابری میں یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا۔ عہدِ اکبری میں اس لفظ کا استعمال نسبتاً زیادہ ہوا ہے۔ اردوئے لشکر، اردوئے معلیٰ، اردوئے حضرت، اردوئے ظفر قرین، اردوئے عالی، اردوئے بزرگ وغیرہ۔ جس سے ان کا مقصد شاہی لشکر اور شاہی فرودگاہ ہے۔ [۱۹۴] یہ لفظ اردو شاہ جہان کے عہد میں اس وقت زیادہ بولا جانے لگا جب اس نے دلی شہر کو نئے سرے سے آباد کیا۔ قلعہ بنایا اور اس کا نام شاہ جہان آباد رکھا۔ اس وقت اس شہر میں مختلف علاقوں سے لوگ آ کر رہنے لگے سب لوگوں کی زبان الگ الگ تھی سب کا اپنا لب و لہجہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ جب آپس میں کسی معاملے پر بحث کرتے تو جہاں بات سمجھانے میں رکاوٹ ہوتی اپنی زبان کے دو چار الفاظ بول کر سمجھانے کی کوشش کرتے۔ جس سے ان کی زبان کے وہ الفاظ دوسرے کی زبان میں ضم ہو جاتے یوں رفتہ رفتہ مختلف زبانوں کے اختلاط کا لہجہ فروغ پانے لگا۔ اور اس میں ایسی تراکیب سامنے آئیں کہ یہ خود ایک زبان کے روپ میں اُبھرنے لگی۔ چونکہ یہ ''زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی۔ اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے اور بادشاہی امراء اسی کو بولا کرتے تھے گویا ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی زبان تھی اور ہوتے ہوتے خود اس زبان کا نام اردو ہو گیا۔'' [۱۹۵]

کچھ اسی قسم کی بات لیکن تھوڑی سی مختلف طریقے سے مولوی عبدالغفور نساخ نے بھی لکھی ہے ان کا کہنا ہے:

> ''شاہ جہان بادشاہ نے ۱۰۵۸ھ میں شاہ جہان آباد کو آباد کیا۔ اور شہر قدیم کہ اندرپت میں تھا معطّل ہو کر ملقب بہ شہرِ کُہنہ و قلعہ کہنہ ہوا۔ شاہ جہان آباد میں اطراف و جوانبِ عالم سے ہر قسم کے ذی علم اور صاحبِ استعداد اور قابل لوگ آ کر مجتمع ہوئے۔ قدیم ہندی متروک ہونے لگی۔ محاورے میں فرق

ہونے لگا۔ زبان اردو کی ترویج شروع ہوئی تو بھی دکھنی لفظوں کا استعمال رہا اور سبب اس کا یہ تھا کہ جو لوگ ہم رکاب سلاطین ممالک دکھن کو جاتے تھے۔ اشعار، شعرائے دکھن، مثل احسنؔ، احمدؔ و اشرفؔ و جعفرؔ و خوشنودؔ و سالکؔ و سعدیؔ و عزیزؔ و فضلیؔ و لطفیؔ و محمودؔ و ہاتفیؔ و ہاشمؔ کے لاتے تھے۔ اور وہ اشعار مطبوع طبع باشندگان شاہجہان آباد ہوتے۔'' [۱۹۶]

یہ دو نظریات تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ہمارے سامنے ہیں لیکن یہ تسلسل ہے اُردو زبان کے فروغ کا۔ ایک نظریہ اسی طرح کا مولانا محمد حسین آزاد نے بھی دیا ہے کہ ''اہلِ سیف، اہلِ قلم، اہلِ حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے۔ اردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اردو ہو گیا۔'' [۱۹۷]

لفظ اردو چونکہ صدیوں سے ترکوں کے ہاں اور دیگر اقوام جو اس لفظ کو اپنی زبان سے اخذ کرنے کے دعویدار ہیں۔ ان کے ہاں بولا جا رہا ہے۔ لیکن زبان کے لیے شاہجہان کے عہد یا اس سے فوراً بعد نافذ ہوا۔ میر امن دہلوی اس لفظ کو بطور زبان مزید پیچھے لے جاتے ہیں۔ [۱۹۸] انشا اللہ انشا نے اپنا نظریہ پیش کیا وہ لکھتے ہیں کہ:

''زبانِ شاہجہان آباد زبان اشخاص قابلِ مصاحبت پیشہ در بار رس و گویائی زنان پری پیکر و کلام اہلِ حرفہ از مسلمانان و گفت گوئی شہد ہا و الفاظ خدم و طبع از قبیل شاگرد پیشہ امراء است تا خاکروب ہم داخل ہمیں جماعت باشد۔ ایں مجمع ہر جا کہ برسد اولاً آنہا دلی وال گفتہ شوند و محلّہ ایشاں محلّہ اہلِ دہلی و اگر تمام را فرا گیرند آں شہر را اردو نامند۔'' [۱۹۹]

مندرجہ بالا چند اقتباسات میں کہیں بھی اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا گیا کہ اردوئے معلّٰی، زبانِ اُردوئے معلّٰی بازارِ اردو یا زبانِ اردو وغیرہ سب عسکری حوالے ہیں جیسا کہ مرزا غالب نے میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھا۔ ''واہ رے حسنِ اعتقاد! اے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا۔ اُردو کہاں، دلی کہاں واللہ اب شہر نہیں کمپ ہے چھاؤنی ہے۔'' [۲۰۰] تو یہ ایک حقیقت ہے کہ نئی دلی (شاہجہان آباد) ایک فوجی چھاؤنی تھی۔ جہاں عسکری تو تھے ہی ان سے متعلقین نیز شاہی خاندان مقیم تھا۔ اور چونکہ شاہی دربار بھی تھا لہٰذا بھانت بھانت کے لوگوں کا وہاں اکٹھے ہونا ایک فطری

عمل تھا۔ اس تمام بحث کو گراہم بیلے نے 'The name 'Urdu کے تحت ان الفاظ میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے جو اصلیت کے قریب تر ہے۔

"An important question is how the word Urdu came to be applied to a language. We have seen that the soldiers in Delhi at a very early date gave up the use of persian among themselves and began to speak a modified form of vernacular. In Delhi this form of speech , to distinguish it from the usual Khari Boli, (and probably also from persian) was called Zaban -i-urdu, the language of Army. As the soldiers and the people intermixed and Intermarried, the language spread over the city into the Suburbs and even into the surrounding district".[201]

''شاہجہان نے سب سے پہلے اردو کے لیے اردوئے معلیٰ کا نام پسند کیا۔ اردوئے معلیٰ ٹیکسالی زبان تھی اور اس کے مقابلے میں دوسری علاقائی زبانوں کو معیاری نہیں سمجھا جاتا تھا۔''[۲۰۲] بعد ازاں کثرتِ استعمال سے معلیٰ لاحقہ سے ہٹ گیا اور صرف اردو رہ گیا جو رائج الوقت ہے۔ شاہجہان کے دور میں شمالی سرحدی علاقے۔ (جسے آج کل خیبر پختونخواہ کہا جاتا ہے) میں خوشحال خان خٹک (۱۰۲۲ھ/۱۶۱۳ء۔۱۱۰۰ھ/۱۶۸۹ء) صاحبِ سیف و قلم ہوا۔ وہ ایک عالم، فاضل اور جملہ علومِ متداولہ کا ماہر معلوم ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن، حدیث، فقہ، فلسفہ، منطق، طب، حکمت، تاریخ، موسیقی، مصوری اور فلکیات کے علاوہ شہسواری، تیغ زنی، نیزہ بازی، تیراندازی، پیراکی اور شکاریات پر بھی اسے کامل دسترس تھی۔[۲۰۳] خوشحال خان خٹک پشتو زبان کے شاعر تھے۔ اوران کی تصانیف کی تعداد ۲۰۰ سے ۲۵۰ تک بتائی جاتی ہے۔ اس کی ساری زندگی میدانِ جنگ میں گزری۔ اوائل عمری میں وہ مغلوں کے لیے لڑتا رہا۔ اور جب مغلوں سے ان بن ہو گئی تو ان کے خلاف جنگ کے میدان میں نبرد آزما رہا۔ اس کی شاعری میں پشتو میں مروّجہ اس عہد کی اردو زبان کے الفاظ تو شامل ہیں ہی لیکن اس نے دانستہ بھی اس زبان کے کئی الفاظ استعمال کیے۔ یہ عمل فطری گنا جا سکتا ہے جو زبان کے جاننے کے بعد رو پذیر ہوتا ہے اور وہ یوں کہ خاص طور پر

شاعری میں جب ایک شاعر اوزان یا بحر کو پورا نہ کر پا رہا ہو تو جو لفظ جس زبان کا بھی اس کے ذہن میں آئے گا اسے استعمال میں لے آئے گا۔ لہٰذا ایسا ہی خوشحال خان خٹک نے کیا۔ مثال کے طور پر اس کے تین اشعار ملاحظہ ہوں:

یو قدم چہ پہ خلاف دنفس رواں شی
(جو پیروی نہ کرے اپنے نفسِ ظالم کی
پہ ھغہ زمان ولی ھغہ انسان شی
ولی کا مرتبہ پائے حقیر انسان بھی) [۲۰۴]

گلعذارہ ، زلفے مارہ ، شہسوارہ ، خوش رفتارہ
بادہ نوشہ ، مے فروشہ ، قصب پوشہ ، موکر
دل نوازہ ، سرفرازہ ، عشوہ سازہ ، لعبت بازہ
خود پسندہ ، سر بلندہ ، شکر خندہ ، لب شکر [۲۰۵]

آخری دونوں اشعار کے تمام الفاظ آج کا اردو دان اچھی طرح سمجھتا ہے۔ جب کہ پہلے شعر میں سے چند الفاظ ایسے ہیں جنھیں آج کی اردو زبان میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس طرح ریختہ میں لکھے گئے ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

پہ سینہ کبن م اودہ مینہ پھر جاگی
زماستا محبّت کورہ کیسے لاگی
د رقیب دنیا د یادہ شوہ کہ حہ شود
سپینۂ خولہ پہ خندہ راکڑہ پھر بھاگی [۲۰۶]

مغلیہ دور کے اس زمانے میں جب سندھ کی طرف نظر کرتے ہیں تو وہاں عبدالحکیم اور میر فاضل جیسے شاعر تو سامنے آتے ہیں لیکن عسکری حوالے سے کوئی ایسا نام سامنے نہیں آتا۔ عہدِ اکبری کا ایک منصب دار سید محمد میر عدل کا ذکر ڈاکٹر جمیل جالبی نے کیا ہے اور ان کے تین بیٹے ابوالفضل، ابوالقاسم اور ابوالمعالی بھی فوج سے وابستہ تھے۔ لیکن ان کی کوئی لکھت سامنے نہیں آسکی۔ البتہ ان کے کارناموں کو کسی شاعر نے نظم کیا ہے جسے ڈاکٹر شاہدہ بیگم نے بھی نقل کیا ہے۔ [۲۰۷] ان حوالوں

سے یہ اندازہ لگانے میں کسی غلطی کا امکان نہیں کہ مغلیہ فوج سندھ میں وارد ہو چکی تھی اور یہاں اُردو کی ابتدا بھی عربوں کی حکومت کے بعد سندھی، عربی، فارسی اور ہندی کے ملاپ سے ہوگئی تھی۔

شاہجہان اپنے بڑے بیٹے داراشکوہ (۲۰ مارچ ۱۶۱۵ء۔۲۹ اگست ۱۶۵۹ء) کو ہندوستان کے تخت پر بٹھانا چاہتا تھا۔ لیکن اس میں سیاست اور جرنیلی خصوصیات کا فقدان تھا۔ شجاع، مراد اور اورنگ زیب اپنے اپنے صوبوں پر قابض تھے۔ آخر کار باہمی جنگوں میں اورنگ زیب کو فتح ہوئی۔ داراشکوہ ایک بلند پایہ عالم اور صوفی تھا۔ تصوف و معرفت کا ذوق ۔فطرت میں شروع سے تھا۔ ۲۵ سال کی عمر میں سفینتہ الاولیاء جیسی کتاب اور تین سال بعد سکینتہ الاولیا جیسی معرکتہ الآراء کتاب لکھی۔ حق نما، حسنات العارفین، مجمع البحرین، سرِ اکبر، اپنشد کے پچاس ابواب کا ترجمہ وغیرہ اس کی تصانیف ہیں۔[۲۰۸] ان کے علاوہ سرالاسرار، سوال و جواب داراشاہ بابالعل داس، نامۂ عرفانی، طریقتہ الحقیقت[۲۰۹] بھی آپ کی تصانیف ہیں۔ ''ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ'' میں درج بالا کتب کے علاوہ دو ہندی تصانیف کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جو دوہاستونگرہ اور سارسنگرہ ہیں۔ جن کا عہدِ تصنیف ۱۶۵۳ء کے آس پاس سمجھنا چاہیے۔[۲۱۰] داراشکوہ فارسی زبان میں شعر بھی کہتا تھا جو مختلف کتابوں میں محفوظ ہیں۔ ہندی میں اس کی کوئی تحریر کہیں سے نہیں مل سکی۔ لیکن اسے رد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ مدرسے کا طالب علم تھا۔ جہاں اردو اور فارسی نیز سنسکرت بھی پڑھائی جاتی تھی۔ اس کے ہاں عالم اور پنڈت یکساں حاضر رہتے۔ اس نے ہندی سے فارسی اور فارسی سے ہندی میں کئی تراجم بھی کروائے۔

محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر (۱۵ ذیقعد ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء۔ یکم ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ/ فروری ۱۷۰۷ء)[۲۱۱] نے سلطنت مغلیہ پر اپنا قبضہ جمانے اور فتنوں کو ختم کرنے کے بعد مملکت کی طرف توجہ دی۔ اس نے ایک وسیع سلسلہ تعلیم جاری کیا۔ اس سے پہلے صرف بڑے بڑے شہروں میں شاہی مدرسے قائم تھے۔ اورنگ زیب نے تمام ممالک محروسہ کے شہروں اور قصبوں میں مدرسے جاری کیے اور ان میں بڑے بڑے فاضل مدرسوں کو پڑھانے کے واسطے مامور کیا۔[۲۱۲] اورنگ زیب کا خطِ نسخ اور خطِ نستعلیق بہت اچھا تھا۔ اس کے دربار میں علماء اور فضلاء بڑی تعداد میں موجود رہتے۔ ان کے علاوہ اس نے دور دراز سے علماء و فضلا کو بلا کر فتاویٰ عالمگیری مرتب کروایا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے دو قرآن شریف لکھ کر اور سات ہزار روپے کے صرف سے ان کی لوح اور

جدول اور جلد بنوا کر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ روانہ کیے تھے۔[۲۱۳] اورنگ زیب عالمگیر کی ادبی کاوش رقعاتِ عالمگیری اور کلماتِ طیبات ادب میں وقیع اضافہ ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر نے سپاہیوں کی زبان اردو میں بھی بھرپور دلچسپی لی۔ رقعاتِ عالمگیری میں اکثر اردو کے الفاظ کو استعمال کیا۔ کلمات طیبات میں بھی یہی صورت ہے۔ فرزند عالی جاہ محمد اعظم کو لکھتے ہیں کہ ''مزہ کھچڑی بریانی شما درزمستان یادمی آید۔''[۲۱۴] اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں گرائمر کی پہلی کتاب 'تحفتہ الہند' آپ کی فرمائش پر لکھی گئی۔ لیکن یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوئی۔ اس کے قلمی نسخے مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔ اس کتاب کے مصنّف کا نام بعض قلمی نسخوں میں اعظم شاہ اور بعض میں معزالدین جہاندار بتایا گیا ہے۔ دیباچہ مصنّف نے خود تحریر کیا ہے۔ دیباچے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ کتاب شہنشاہ اورنگ زیب کے کہنے پر اس کے شہزادوں کو اردو زبان کے قواعد سکھانے کے لیے لکھی گئی تھی۔[۲۱۵] اگر یہ کتاب اعظم شاہ کی تھی تو وہ عالمگیر کا بیٹا تھا۔ اور اس کا اپنا ایک عسکری حوالہ ہے اور اگر معزالدین جہاندار شاہ تھا تو وہ اورنگ زیب کا پوتا، بہادر شاہ کا بیٹا تھا جو ۸/اپریل ۱۶۶۳ء کو دکن میں پیدا ہوا اور جنوری ۱۷۱۳ء کو قتل ہوا لیکن یہ دونوں مصنّف نہیں ہو سکتے کیونکہ اورنگ زیب نے یہ کتاب اپنے شہزادوں کو قواعد سکھانے کے لیے لکھوائی تھی۔ عالم گیر کی فاضل بیٹی زیب النساء بھی فارسی اور اردو کی شاعرہ تھیں۔[۲۱۶]

عالم گیر نے جہاں سلطنت کو اعلیٰ مقام تک پہنچایا، دکن جیسے علاقوں کو سر کیا۔ سلطنت کو وسعت دی وہیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کا زوال عالمگیر سے ہی شروع ہوا۔ اور اس کے بعد آنے والے حکمرانوں میں وہ صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اتنی بڑی سلطنت کو سنبھال سکتے۔ یورپین یہاں آنا شروع ہو چکے تھے یہاں تک کہ عالم گیر کے عہد میں برطانیہ نے بھی اِس سرزمین پر قدم رکھ دیے۔ عالم گیر کا منجھلا بیٹا قطب الدین محمد اعظم شاہ ملقب بہ عالی جاہ (۱۱ جولائی ۱۶۵۴ء/ ۲۵ شعبان ۱۰۶۳ھ۔ ۸ جون ۱۷۰۷ء/ ۱۸ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ)[۲۱۷] نے صرف ۸ دن حکومت کی۔ اور اپنے بڑے بھائی معظّم شاہ کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اعظم شاہ ہندی زبان سے بے حد الفت رکھتا تھا۔ نواز نامی ایک مسلمان شاعر نے اعظم شاہ کی خواہش پر ۱۶۸۰ء میں شکنتلا ناٹک لکھا۔ اسی شہزادہ کے فرمان سے مختلف کویّوں نے مل کر بہاری شاعرِ مشہور کی 'ست سٹی' کی تدوین کی۔ یہ نسخہ اشاعتِ اعظم کے نام سے مشہور ہے۔[۲۱۸] کہا جاتا ہے اعظم شاہ تین فنون میں اپنی

نظیر نہیں رکھتا تھا۔ اول: معرفتِ اصول موسیقی و رقص، دوم: شناختِ کیفیت جواہر، سوم: اسلحہ آہنی کے جوہر کو سمجھنا۔[۲۱۹]

۶۔ عسکری اہلِ قلم کی روایت کا رخ جنوبی ہند کی طرف

ایک طرف شمالی ہند میں فارسی اور ترکی زبانوں کے اثرات سے لسانی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ اور نئی زبان اپنے تشکیلی سفر پر رواں دواں تھی۔ جو ان علاقوں میں مغلوں کی آمد سے پہلے اثرات قبول کر چکی تھی۔ جب علاؤ الدین خلجی (عہدِ حکومت ۱۲۹۵ء۔۱۳۱۶ء) نے رنتھمبور، گجرات، دیوگری اور مہاراشٹر پر حملے کیے اور یہ علاقے نیز ملیبار تک کے علاقے اپنے زیرِ نگیں کر لیے۔ ان مہموں کے حالات سے ظاہر ہے کہ پنجاب اور نواحِ دہلی کے کتنے سپاہی اس لشکر میں ہوں گے اور یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کی زبان نے ان مفتوحہ علاقوں کی زبان پر کیا اثر ڈالا ہوگا۔ چونکہ سلطان علاؤ الدین خلجی کے زمانے میں ملک دکن دہلی میں شامل ہو گیا اور اس کے بعد تقریباً چالیس سال تک دہلی سے اس کا تعلق رہا۔ پھر ملک کافور اور محمد تغلق (۷۲۵ھ/۱۳۱۵ء، ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء) کا جب عہد آتا ہے۔ تو تاریخ فرشتہ کے مطابق:

> ''محمد تغلق نے فرمان جاری کیا کہ وہ دلی جس پر مصر بھی رشک کرتا تھا ویران اور سنسان کر دی جائے اور تمام شہری عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے اور جوان سب دیوگڑھ منتقل ہو جائیں۔ جو غریب ہوں اور جن کے پاس سفر خرچ نہ ہو اسے خزانہ شاہی سے روپیہ دیا جائے۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ دہلی سے لے کر دیوگڑھ تک ہر ہر منزل پر مسافروں کے لیے سرائیں بنائی جائیں۔ اور سڑک کے آس پاس سایہ دار درخت لگائے جائیں۔ تاکہ مسافر سایہ دار درختوں کے نیچے آرام سے سفر کریں۔ دیوگڑھ کا نام، دولت آباد رکھا۔ اور اس میں بہت عالی شان عمارتیں بنانا شروع کیں۔ قلعہ دیوگڑھ کے آس پاس خندق کھود کر دولت آباد گھاٹ اور یلورہ کے پاس بڑے بڑے حوض بنوائے اور خوبصورت باغات لگوائے۔''[۲۲۰]

القصہ دہلی تو اس وقت خالی ہوا۔ عام عوام کے علاوہ جو فوجی محمد تغلق کے ساتھ دولت آباد

گیے وہ مستقلاً وہیں رہ پڑے اور اس علاقے کی تہذیب اور ثقافت کے ساتھ ساتھ زبان میں بھی تبدیلی کا باعث بنے۔ لہٰذا اب متاثرہ زبان نہ صرف دولت آباد بلکہ پورے دکن میں مختلف ناموں سے پکاری جانے لگی۔ یعنی ہندی، ہندوی، گوجری، گجری، دکنی، مسلمانی، ترکاٹا، زبانِ اہلِ ہند، زبانِ دہلوی، زبانِ ہندوستانی وغیرہ۔[۲۲۱] بالآخر محمد تغلق کے دور میں امرائے دکن نے باہم اتفاق کر کے سلطان کے خلاف بغاوت کی۔ دو سال کی جدوجہد کے بعد سلطان کے لشکر کو ہزیمت اٹھانا پڑی۔ اور حسن خان، ظفر خان علاؤ الدین بہمن شاہ کے خطاب کے ساتھ دکن کا خود مختار حاکم بن بیٹھا۔[۲۲۲]

سلطان علاؤ الدین بہمن شاہ اگرچہ غلامی سے حکمرانی تک پہنچا تھا لیکن اس کی رگوں میں ایک حکمران خاندان کا خون گردش کر رہا تھا۔ وہ خود اور اس کے کئی جانشین نہ صرف علم دوست اور علم پرور تھے بلکہ خود بھی ذی علم تھے۔ ان کے زمانہ میں دکن علم وفن کا مرکز تھا۔ جس میں وہاں کی علاقائی زبانوں کو نئے رنگ میں فروغ دیا جا رہا تھا۔ اور اسے سبقت حاصل تھی۔ انھوں نے عرب و عجم کے بڑے بڑے علماء کو بھی دکن میں بلوا لیا تھا۔ حکمرانوں کی نوازشات سے مؤلفین و مصنفین کو سرفراز کیا جاتا تھا۔ دکھنی زبان کا رواج ہو گیا اور روزمرہ بول چال میں لب ولہجہ اور زبان استعمال ہونے لگی۔ یہاں تک کے فرشتہ کے مطابق اس کو سلطنت کی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔[۲۲۳]

جب بہمنی سلطنت قائم ہو رہی تھی اور اپنی بنیادیں مضبوط کرنے اور ریاست کی حدیں پھیلانے کی کوشش میں تھی جس سے اسلام کا دائرہ بھی پھیل رہا تھا تو پانچ بھائیوں [۲۲۴] کی ایک جماعت نے وجے نگر میں اپنی حکومت اس لیے بنائی کہ جنوبی ہندوستان کی طرف اسلام کی پیش قدمی کو روکا جا سکے۔ اس سے اتنا تو ہوا کہ ”بہمنی سلطنت کرشنا ندی کے جنوب میں اپنا تسلّط نہ جما سکی۔ لیکن وجے نگر کے رایوں نے سنسکرت اور تیلگو ادب کی جب سرپرستی کی تو دکھنی لسانی اثرات کو نہ روک سکے۔ اور ندی کے دوسری طرف بھی دکھنی الفاظ کا استعمال ہونے لگا۔“[۲۲۵]

بہمنی حکمرانوں کی سرپرستی سے اس زبان کو فروغ ملا۔ دربار میں دانشور اور اہلِ قلم بھی اسی زبان کو استعمال کرتے تھے۔ حاکمِ وقت چونکہ سپہ سالار بھی ہوتا تھا۔ اس لیے اس کی سپاہ میں بھی جو ویسے بھی شمالی ہند سے آئی تھی۔ اس زبان نے ترقی کر لی۔ یوں اس زبان کی دیوار جو استوار ہو رہی تھی۔ وہ کافی مضبوط دکھائی دے رہی تھی۔ بہمنی سلطنت کے کمزور ہونے اور پھر ختم ہونے سے

پانچ ریاستیں، عادل شاہی ،قطب شاہی ،عماد شاہی ،نظام شاہی اور برید شاہی [۲۲۶] وجود میں آئیں۔ان تمام ریاستوں میں ہندی اردو زبان وادب کو فروغ ملا ان ادوار میں اردو کے فروغ میں جن طبقات کا نام آتا ہے۔ان میں زیادہ تر مبلغ ،عالمِ دین ،فقیہہ اور تجار وغیرہ تھے۔لیکن ان کے علاوہ بھی اجتماعی طور پر یہ سب کچھ عسکری حکمتِ عملی سے ہوا۔عسکریوں میں سے جن اشخاص کی انفرادی کاوشیں سامنے آتی ہیں وہ اپنے اپنے دور کا حکمران طبقہ تھا جو اپنے اپنے مراتب کے لحاظ سے اپنے اپنے عسکری دستوں کے کماندار بھی تھے۔ یہاں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔کہ بادشاہ یا مہاراجہ یا راجہ یا رئیس یا سربراہ ہی عام طور پر زبان کی ترقی کا سبب ہوتا ہے۔ان کے تابع تمام ادارے اور عوام ہوتے ہیں۔''لوگ اپنے سربراہوں کی نقل کرتے ہیں اور وہ جو زبان بولتے ہیں یا جس زبان کی پذیرائی کرتے ہیں وہی زبان ترقی کرتی ہے۔'' [۲۲۷] ہندوستان میں سب سے پہلے گجرات اور دکن میں یہ صورتِ حال دیکھنے میں آئی کہ وہاں کے حکمرانوں نے جب ہندی (اُردو) کو اپنایا تو پورے ملک میں اور پھر ملحقہ ریاستوں میں اس زبان کو خوش آمدید کہا گیا یہاں تک کہ یہ سلسلہ ملحقہ ریاستوں سے نکل کر گردو پیش میں بھی چلا گیا۔

ان ریاستوں کے ادبی ورثہ کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو تقریباً تمام حکمرانوں کو دکھنی، ہندی یا اردو (جو بھی نام دیں) میں کچھ نہ کچھ تحریری کام کرتے یا دادِ شجاعت دیتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ان حکمرانوں یا سپہ سالاروں کے علاوہ اردو کی ترویج میں زیادہ تر حصہ وہاں کے صوفیاء، فقرا، مبلّغین، تجار وغیرہ کا بھی ہے لیکن دربار سے منسلک شعراء وادباء خواہ وہ کسی بھی طبقے سے متعلق تھے۔ وہ حکمرانِ وقت (صاحبِ دربار) کے ساتھ جنگ کا حصہ ہوتے تھے اور اسی سپہ سالار کے ساتھ متحرک رہتے تھے لہٰذا ان کو عسکری خدمات سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔لیکن صاف ظاہر ہے وہ با قاعدہ فوج کا حصہ نہیں ہوتے تھے۔انھیں بے قاعدہ فوج سے تعبیر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا بلکہ وہ بلا قاعدہ فوج کا حصہ ہوتے تھے لیکن یہ ان کا ثانوی فعل تھا اس لیے وہ زیرِ بحث نہیں۔

جنوبی ہند کی تاریخ کا مطالعہ جب ہمارے سامنے اردو لسانیات کو کھولتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ حکمرانوں (سپہ سالاروں) کی کاوشوں سے دسویں صدی ہجری میں دہلی کی پرانی بولی دکن / جنوبی ہند میں جب فروغ پانے لگتی ہے اور سرکاری زبان بنتی ہے تو نئی سج دھج سے عربی رسم الخط میں کتابی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔سید ہاشمی فرید آبادی ایک حیرانی کے ساتھ رقم طراز ہیں کہ:

''فارسی پر اس کا غلبہ قابلِ تعجب ہے کیونکہ ان دنوں شمالی ہند سے زیادہ
ممالک دکن ایرانی اثرات کا مہبط بنے ہوئے تھے۔ علمائے عراق وعجم کے
قدم اور ایران کے عقائد وشعائر دکنی درباروں پر چھا گئے تھے۔ شاید صوفی
بزرگوں کی کرامت تھی کہ وہاں کے بادشاہوں تک کو ہندی کا مرید کر
دیا۔'' [۲۲۸]

صوفیا اور مبلغین کا اثر ورسوخ اپنی جگہ لیکن صوفیا اور علماء میں زیادہ تر فارسی زبان کے شیدائی تھے۔ انہیں اس زبان کی طرف آنے پر عوام نے مجبور کیا۔ اور عوام پر ابتدائی اثرات عساکر نے ڈالے جو وہاں صوفیا کی کثرت سے آمد سے پہلے حملہ آور ہوئے۔ اور وہاں کی عوام میں لین دین اور میل ملاپ کے دوران نئے الفاظ کی تشکیل کی۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ مؤرخین نے ابتداً اس طرف توجہ کیوں نہیں دی؟

اس کا جواب میرے خیال میں یہ ہے کہ محمد تغلق کی فوجیں جو شمالی ہند سے اس کے ساتھ آئی تھیں اور جنوبی ہند میں آباد ہوگئی تھیں۔ نیز شاہوں کا اپنا مزاج جو ہندی یا دکھنی اردو کی طرف مائل تھا اور جنھوں نے اس زبان کی سرکاری سطح پر سرپرستی کی اس زبان کے فروغ میں ممد ومعاون ثابت ہوئے۔ میں پھر اس قول کو دہرانا چاہوں گا کہ جو مزاج حکمرانوں کا ہو عوام اسی میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی ہوا کیونکہ حسن گنگو بہمنی سے آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ تک سب ہی دکھنی اردو کے دلدادہ تھے اور دل وجان سے اس زبان کو چاہتے تھے۔

آخر مغلوں کی فتوحات کا دائرہ پھیلتا پھیلتا دکن کی حدود کو سر کر گیا اور یہ تمام ریاستیں ایک مدت تک شمالی ہند کی حکمرانی سے آزاد رہنے کے بعد اورنگ زیب کے عہد میں دوبارہ شمالی ہند کے زیرِ نگیں آ گئیں۔ جس سے دکن کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ ان ادوار میں دکن کی ریاستوں میں اردو شاعری کی اکثر اصناف نے ترقی کی۔ نثر کی بھی ابتدا ہو چکی تھی اور اب وہ بھی آگے بڑھنے لگی تھی۔ جب دکن کی ریاستیں مغل حکومت کا حصہ بن گئیں تو جو لوگ اس وقت ہندی (اُردو) علم وادب کا حصہ تھے وہ باقی رہے۔ انھوں نے خصوصاً شاعری کی لو کو تیز کیا جب اس طرح اتر اور دکھن کا ملاپ عسکری حکمتِ عملی اور فتوحات سے عمل پذیر ہوا تو اتری ہندوستان میں بول چال کی زبان اگرچہ اردو تھی لیکن اس میں شعر گوئی کا رجحان قدرے کم پایا جاتا تھا۔ فارسی زبان میں ہی

شعر کہنے پر فخر کیا جاتا تھا لیکن جب یہاں کے شاعروں نے دکن کی اردو شاعری کو دیکھا اور ولی کا دیوان یہاں پہنچا تو انہوں نے بھی فارسی چھوڑ کر اردو ہی میں شعر کہنا شروع کیا۔ ادھر دکن کے شاعروں کو اتر کی اردو زبان (جو بول چال میں رائج تھی) سے مدد ملی۔[۲۲۹]

۷۔ یوروپین کی آمد

برِصغیر میں سکندر اعظم کے بعد یورپ سے آنے والوں میں سے آرمینین کو سبقت حاصل ہے۔ غالباً تھامس کینا (Thomas Cana) پہلا آرمینی نو وارد ہے جو ۷۸۰ء میں ساحل ملیبار پر فروکش ہوا اور اس کے بعد برابر آرمینی عیسائی وقتاً فوقتاً بغرضِ تجارت اور تلاشِ روزگار میں آتے رہے۔[۲۳۰] یہ لوگ طویل مسافت کر کے ایران، افغانستان اور تبت سے ہوتے ہوئے برصغیر میں آتے تھے اور اپنا مالِ تجارت بیچ کر واپس چلے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے انھیں شہنشاہ اکبر نے آگرہ میں آباد ہونے کی ترغیب دی۔ اور وہ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں سے دارالخلافہ میں آ کر آباد ہوئے۔[۲۳۱] آرمینیا سے آنے والے ان لوگوں کے مقاصد عسکری یا سیاسی نہیں تھے۔ ان لوگوں نے یہاں کی زبان سیکھی اور یہاں کی زبان کے الفاظ آرمینیا میں لے گئے آرمینین جو برِصغیر میں آباد ہوئے۔ یا اس سے پہلے آئے اور چلے گئے۔ ان میں اردو زبان کے ارتقا کی ان کاوشوں میں حصہ لینے والا کوئی شخص بھی عسکری نہیں تھا۔ اس میں دیگر آرمینین اردو شعراء کی نسبت دو شعراء خاصے مقبول ہوئے۔ ان میں سے ایک جو ہانس تھے جو صاحب تخلّص کرتے تھے اور ان کا یہ شعر مقبول ہوا۔

دیکھنا توڑ کے وحشت میں نکل جاؤں گا
مجھ کو پہناتے ہو زنجیر پہ زنجیر عبث [۲۳۲]

اور دوسرے شاعر ایرن جیکب فرحت تھے:

ستم ایسا نہ کر اے باغباں فصلِ بہاری میں
گرائیں بجلیاں ایسا نہ ہو آہیں عنادل کی [۲۳۳]

۱۴۹۷ء میں پرتگال کے بادشاہ امانوال نے واسکوڈے گاما کو جنوب کی راہ سے ہندوستان جانے کا حکم دیا۔ اس وقت ہندوستان میں سکندر لودی بن بہلول خان لودی بادشاہ تھا۔[۲۳۴] یہ

لوگ ہر طرح کی عسکری تیاری کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ ان تجارتی جہازوں کا تعلق مرچنٹ نیوی سے تھا۔ یہ لوگ باقاعدہ تربیت یافتہ ہوتے تھے۔ مشکلاتِ سفرِ بحری کے ساتھ ساتھ انھوں نے جنگ کی تربیت بھی حاصل کی ہوتی تھی۔ یہ پرتگیزی واسکوڈے گاما (۱۴۶۰ء، وفات ۲۴ ستمبر ۱۵۲۵ء کو چن، ہندوستان، تدفین پرتگال) کی زیرِ کمان چار بحری جہازوں گریل، رافائیل، ریوار اور ساریو کے ساتھ ہندوستان میں مئی ۱۴۹۸ء میں گیارہ ماہ کی مسافت کے بعد ملیبار میں کالی کٹ کے مقام پر پہنچے۔ اگرچہ پرتگیزیوں کی آمد کا مقصد تجارتی بتایا جاتا ہے لیکن جب اس کا جائزہ لیتے ہیں تو اس آمد کا نتیجہ عسکری دکھائی دیتا ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مقاصد تجارتی نہیں بلکہ عسکری برتری تھے۔ پرتگالیوں کی آمد بظاہر اتنا بڑا واقعہ دکھائی نہیں دیتا یہ ''بظاہر اتنا چھوٹا، اتنا معمولی اور اس درجہ عامتہ الورود تھا کہ بندرگار کالی کٹ کے باہر کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہوسکی۔ تاہم آگے چل کر یہ واقعہ پاک و ہند کے اندر ایسے عناصر بروئے کار لانے کا موجب بن گیا جن کی وجہ سے ہمارا ملک اجنبی سامراج کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔[۲۳۵] واسکوڈے گاما کی آمد پر وہاں کے راجہ سمبہ مورام یا شیام رام نے بھرپور استقبالیہ کا پروگرام ترتیب دینا چاہا لیکن اہلِ عرب ان کی آمد کا مقصد سمجھ گئے تھے۔ لہٰذا انھوں نے راجہ کو ایسا نہ کرنے پر آمادہ کرلیا۔ آر۔ سی۔ موجمدار (Mujamdar) لکھتا ہے:

> "Portuguese instead of confining themselves within the limits of legitimate trade , becames unduly ambitious to establish their supermeacy in the eastern seas by forcibly depriving the merchants of other nations of the benefits of their commerce, and molesting them inevitably brought them in to hostilities with the ruler of calicut whose prosperity was largely dependant on Arab merchants.'[۲۳۶]

واسکوڈے گاما کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ فوراً اپنے ملک چلا گیا مگر دوسرے سال اسی بادشاہ نے الوارز کاریل کو مع آٹھ پادریوں کے ۱۳ جہاز دے کے بجمعیت ۱۳ ہزار سپاہیوں کے ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔ مگر ان جہازوں میں سے صرف چھ کالی کٹ تک پہنچے۔[۲۳۷]

۱۵۰۵ء میں المیدا (Almida) اور ۱۵۰۹ء میں الفانسوڈے البوقرق (Albuquerque) پرتگالی حکومت کی طرف سے بحیثیت گورنر ہندوستان آیا اور اس نے ۱۵۱۰ء میں گووا پر قبضہ کرلیا۔[۲۳۸] پرتگالی چونکہ پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کا سوچ رہے تھے لہٰذا اب انھوں نے ہندوستان کی زبانیں سیکھنے اور سمجھنے میں دلچسپی لینی شروع کردی۔ اور پھر رفتہ رفتہ گووا کے علاوہ ڈامن اور ڈیو وغیرہ جزائر کو بھی اپنے قبضے میں کرلیا۔ اور اپنی خواہشات کو وسعت دینے لگے۔ پرتگالیوں کی آمد اور چند علاقوں پر قبضہ، عوام سے میل جول اور ربط سے لسانی تبدیلیاں ایک فطری عمل تھا۔ پرتگالی زبان کے الفاظ نے مقامی زبان (ہندی یا اردو) میں اپنا رنگ دکھایا۔ اور مقامی زبان نے پرتگالی میں داخل ہونا شروع کردیا۔ اس مخلوط زبان میں پرتگالی الفاظ کچھ اس طرح گھل مل گئے کہ دورِ حاضر کی روزمرہ میں وہ ابھی تک موجود ہیں اُن بہت سے الفاظ میں سے چند الفاظ ملاحظہ ہوں۔ چابی، اچار، انناس، پادری، مستری، نیلام، بالٹی، الماری، تمباکو وغیرہ۔[۲۳۹] سولھویں صدی عیسوی کے اختتام تک پرتگالی اپنے مدِمقابل آنے والی ہر طاقت پر غالب رہے۔ یہاں تک کہ اکبر نے اپنے جہازوں کو بحرِ قلزم میں بھیجنے کے لیے پرتگیزیوں (پرتگالیوں) سے اجازت نامہ حاصل کرکے ان کے اقتدار کو چپ چاپ تسلیم کرلیا۔[۲۴۰]

پرتگالیوں کی کامیابی کا حال سن کر ہالینڈ کے (ڈچ) لوگوں کو بھی ہندوستان کی سونے کی چڑیا کے شکار کا لالچ دامن گیر ہوا اور آخرکار "۱۶۰۱ء میں وہ بھی ایک تجارتی کمپنی بنا کر سواحلِ ہند پر براجمان ہوگئے۔"[۲۴۱] "ولندیزیوں نے یہاں آکر ایک ایسی زبان دیکھی جس میں یورپی الفاظ موجود تھے۔"[۲۴۲] گویا پرتگالی زبان کے اثرات واضح نظر آتے تھے۔ پرتگالیوں کی طرف سے یہ اثرات اردو زبان کے لیے ایک تحفہ تھے۔ اسی دوران انگلستان نے بھی اپنی کوشش جاری کردیں۔ انھوں نے ۱۶۰۰ء میں Governor and company of Merchants Trading into East Indies, (تجارتی کمپنی) بنائی۔ جسے پہلی ایسٹ انڈیا کمپنی بھی کہا جاتا ہے[۲۴۳] اور ملکہ الزبتھ سے اجازتِ سفر حاصل کرکے ۱۶۰۸ء میں ہندوستان کا رخ کیا۔ کمپنی کے اعلیٰ عہدے دار کپتان ہوپکنس (Hopkins) نے مغل شہنشاہ جہانگیر کے دربار سے تجارتی اجازت نامہ حاصل کیا۔[۲۴۴] انگریزوں (فرنگیوں) نے ۱۶۳۳ء میں موسولی پٹم میں مشرقی ساحل پر ایک کوٹھی قائم کی اور پھر رفتہ رفتہ اس میں تیزی آتی گئی۔ ان کی آمد سے مقامی زبان میں انگریزی کے الفاظ

شامل ہونے لگے۔ بہت سے الفاظ کو اردوا لیا گیا اور ایک فطری لسانی تبدیلی روپذیر ہونے لگی۔[۲۴۵]

انگریزوں کے تتبع میں فرانسیسیوں نے بھی اپنی ایسٹ انڈیا کمپنی بنائی اور ۱۶۴۲ء میں رش لو (Riche Lieu) نامی فرانسیسی نے دکھنی ہندوستان میں ورود کیا۔ فرانسیسیوں نے پانڈے چری کی بنیاد ڈالی اور اسے اپنا اڈا بنالیا۔[۲۴۶] پرتگالی، ولندیزی اور فرانسیسی تو وسیع پیمانے پر اردو زبان میں اپنا حصہ نہ ڈال سکے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا عرصۂ قیام ہندوستان میں اتنا زیادہ اور پرامن نہیں رہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پرتگالیوں سے سوسال بعد برطانوی آئے، اس سوسال میں پرتگالی کسی حد تک اپنے الفاظ کو اردو زبان کا حصہ بنانے میں کوشاں ضرور رہے لیکن پھر آپس کے جھگڑوں اور برتری کے حصول میں وہ توجہ نہ دے سکے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر جو لوگ ہندوستان میں رہ گئے۔ وہ یہاں کا حصہ بن گئے۔ اور اردو کو اپنی زبان بنالیا۔ جس کی مثال ہمیں ان کے ادب وشعر سے ملتی ہے۔ تاریخی اسباب اور معاشرتی ضرورتوں کے تحت رواج پانے والی اس زبان میں جو اصل میں شمالی ہند کی ایک عوامی بولی تھی۔ سنسکرت، قدیم ایرانی، قدیم یونانی، تورانی، فارسی، عربی، ترکی، فرانسیسی، پرتگالی، انگریزی اور نامعلوم کن کن زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے رہے۔[۲۴۷] اور اردو زبان کے ارتقا کا باعث بنتے رہے۔ اس کے برعکس ہندوستان کے دوسرے صوبے جو اپنے اپنے زمانے میں الگ اور مختلف ممالک کی حیثیت بھی رکھتے تھے ان کے ہاں بولی جانے والی زبانوں میں پنجابی اور دیگر بولیوں کے الفاظ اور لہجے کے باعث وہاں کی اردو قدرے مختلف رنگ میں سامنے آئی۔

تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی افواج میں بھی یورپین سپاہی اور عہدے دار شامل تھے۔ جس کی ایک مثال دارا کی سپاہ میں نکولا مانوچی یا منوکی کی ہے۔ یہ ایک اطالوی تھا جو دارا شکوہ کے توپ خانے میں ملازمت کرتا تھا اور بکھر کے محاصرے کے وقت ۱۶۵۹ء میں قلعے میں موجود تھا۔[۲۴۸] بلکہ مانوچی ۱۶۵۸ء میں اورنگ زیب اور دارا کے درمیان سام گڈھ میں ہونے والی جنگ میں شریک تھا۔ اور اس کے بعد بکھر کے قلعے میں توپ خانے کا کمانڈر مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے اپنی سرگزشت 'استوریادی موگور' میں کئی الفاظ ہندوستانی کے استعمال کیے ہیں جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ہندوستانی زبان اچھی طرح جانتا تھا۔[۲۴۹] اس کی

سرگزشت کے ذریعے سے بھی اطالیہ میں بہت سے ہندوستانی الفاظ پہنچے۔

الغرض یہ عمل سالہا سال تک جاری رہا انگریزوں نے ہندوستان میں آمد کے بعد یہ محسوس کیا کہ یہاں نئی تہذیب میں ڈھلنا اور زبان کو سیکھنا بہت ضروری ہے۔لہٰذا انھوں نے اپنے ملازمین کے لیے لازمی قرار دیا کہ وہ اردو سیکھیں اور اس کا امتحان پاس کریں۔انگریزوں کا اردو زبان سیکھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ عیسائیت کی وسیع پیمانے پر تبلیغ کی جا سکے۔چنانچہ جب انھوں نے اردو زبان میں لکھنا شروع کیا۔تو ایسے ادب کی تخلیق پر زور دیا گیا جو مسلمانوں کو اسلام سے بیگانہ کرتا تھا۔اور اسی بیگانگی کا سبب تھا کہ بہت سی مسلم عورتوں نے عیسائی سپاہیوں سے شادیاں کیں اور ان سے جو اولادیں ہوئیں وہ عیسائی تھیں۔

انگریزوں نے بائبل وغیرہ کے تراجم کے علاوہ لغات اور قواعد کی تیاری میں دلچسپی لی۔ اس سے قبل نہ تو لغات کی ترتیب کا کوئی معقول کام ہوا تھا۔اور نہ ہی قواعد کی طرف کسی نے توجہ دی تھی اس ضمن میں غیر عسکری اہلِ قلم کے علاوہ جن عسکری اہلِ قلم نے اپنی خدمات انجام دیں ان کی انفرادیت کے حوالے سے الگ سرسری طور پر روایت کے سلسلے کو جن لوگوں نے آگے بڑھایا ان کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ان لوگوں نے جہاں اردو رسم الخط میں اپنی تحریریں چھوڑیں وہاں رومن میں اور انگریزی میں بھی کام کیا۔اردو رسم الخط میں جو سب سے پہلی کتاب شائع ہوئی وہ اپریل ۱۷۴۳ء میں جرمنی کے شہر ہالے سے بنجمن شلز کی کتاب Summula doctrinae in lingvum indostanicum ہے۔[۲۵۰] یہ نام اگرچہ جرمن زبان میں ہے لیکن سلیم الدین قریشی کا دعوی ہے کہ یہ اردو رسم الخط میں پہلی کتاب ہے۔

انگلستان میں ۱۷۷۷ء تک فارسی کے لیے نسخ ٹائپ استعمال کیا جاتا تھا۔۱۷۷۷ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز (۱۷۷۲ء۔۱۷۸۴ء) نے نستعلیق چھپائی کی ضرورت کو مدِنظر رکھتے ہوئے چارلس ولکنز کو یہ ذمہ داری سونپی اور پھر "ولکنز کے نستعلیق ٹائپ سے ہندوستان میں جو سب سے پہلی کتاب شائع ہوئی وہ ایک فوجی گلیڈون کی تھی۔اور اردو طباعت کی سب سے پہلی مثال مرزا سودا کی ایک اردو غزل ہے۔"[۲۵۱] یاد رہے کہ مرزا سودا کا تعلق بھی فوج سے تھا۔ اُردو ادب کے فروغ میں چند خاندانوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔جن میں گارڈنر خاندان، فانتوم خاندان، لیزا خاندان، سومر خاندان اور بالتھرز خاندان وغیرہ کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔ان

خاندانوں میں ہر دو طبقے سے تعلق لکھنے والے اہلِ قلم تھے۔ کچھ ایسے تھے۔ جنھوں نے سول ملازمتیں اختیار کرتے ہوئے اپنی خدمات انجام دیں۔ اور کچھ اہلِ قلم نے سول پر فوج کو ترجیح دی اور صاحبان سیف و قلم کہلوائے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں قدم جمانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ لیکن ابھی تک اس نے زیادہ طاقت نہیں پکڑی تھی۔ اس اثناء میں انھوں نے کلکتہ میں ولیم نامی ایک قلعہ تعمیر کیا۔ اور پھر انگلستان سے ایک گورا پلٹن بھی طلب کر کے تعینات کر لی۔ اس قلعہ یعنی فورٹ ولیم نے بعد میں اردو زبان وادب کے فروغ اور ارتقا میں فورٹ ولیم کالج کے حوالے سے ایک اہم کردار ادا کیا۔ ''کمپنی بہادر نے شروع میں تین مختلف افواج قائم کی تھیں۔ مدراس آرمی، بنگال آرمی اور بمبے آرمی۔ یہ تینوں افواج ایک دوسرے سے الگ اور آزاد تھیں۔ ان کے کمانڈر انچیف بھی علیحدہ علیحدہ تھے۔''[۲۵۲] ان تینوں افواج کی نفری مختصر سی تھی۔ اور چونکہ انھیں ضرورت کے مطابق خود بھی جوان بھرتی کرنے کی اجازت تھی لہٰذا مقامی لوگوں کو زیادہ مواقع ملے۔ یہاں تک کہ کمان انگریزوں کی ہوتی تھی اور جوان ہندوستان کے۔ اس سے ایک طرف اردو زبان کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا تو دوسری طرف کمپنی کے اپنے مقاصد بھی حل ہوئے۔ جو ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق حسبِ ذیل تھے:

> ''ایک تو اپنی تجارتی کوٹھیوں کی حفاظت کے لیے، کیونکہ اٹھارویں صدی میں جب مرکزی سلطنت ٹوٹی تو طاقت ور فوجی مہم جوؤں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ اس وجہ سے انہیں فوج کی ضرورت پڑی جو اس لوٹ مار سے انھیں محفوظ رکھ سکے۔ دوسری وجہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی باہمی رقابت تھی۔ جو یورپ اور امریکہ سے ہوتی ہوئی بعد ازاں ہندوستان بھی آ گئی۔ اور یہاں دونوں نے ایک دوسرے کی رقابت میں اپنی فوجوں کی تعداد بڑھائی اور وہ نئی ایجادیں جو سترھویں صدی میں یورپ میں ہوئیں انہیں لے کر آئے۔ خصوصیت سے فوجی تنظیم و ترتیب اور تکنیک۔''[۲۵۳]

بنگال میں حکمرانوں کا شعور جاگ اٹھا تھا۔ نواب علی وردی خان انگریزوں کے عزائم سے واقف ہو چکے تھے۔ ان کی وفات کے بعد مرزا محمد، نواب سراج الدولہ جب مسندِ حکمرانی پر جلوہ افروز ہوئے۔ تو انھوں نے انگریزوں کی دست درازیوں کو روکنا چاہا۔ جس کے نتیجے میں ۱۷۵۷ء کی جنگ

پلاسی ہوئی۔ اگرچہ انگریزوں کے پاس فوج نواب سراج الدولہ کی نسبت بہت کم تھی لیکن لارڈ کلائیو نے ایک اور چال چلی اور نواب کے وزیر میر جعفر کو کئی دیگر سالاروں اور سرداروں کے ہمراہ خرید لیا۔ جس سے موصوف ان غداروں کی وجہ سے شہید ہوئے۔ اور میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ اور بنگال، بہار اور اوڑیسہ مسلمانوں کے ہاتھ سے چلے گئے۔ جس دن نواب سراج الدولہ نے جامِ شہادت نوش کیا اسی دن ہندوستان میں گویا انگریزی عمل داری کی بنیاد رکھ دی گئی اور پھر آٹھ سال بعد ''۱۷۶۵ء میں شاہ عالم بادشاہ نے جو اس وقت دلی کے تخت پر بیٹھا تھا۔ صوبہ بہار، بنگالا اور اوڑیسہ تینوں صوبوں کی استمراری دیوانی کا پروانہ کمپنی کے نام لکھ دیا۔'' [۲۵۴]

نواب سراج الدولہ (ش: ۱۳ جون ۱۷۵۷ء) کو فارسی اور اردو میں بڑی دلچسپی تھی۔ وہ خود بھی عالم تھا اور اہلِ علم کی دل سے قدر کرتا تھا۔ اس کا دربار ادبی مرکز تھا۔ اس کے دربار میں نامی گرامی شعراء کو شرفِ باریابی حاصل تھا۔ اس نے علم وادب کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ ان کے بعد ''نواب شجاع الدولہ اور ان کی بیوی بہو بیگم نے فیض آباد کو ایک ادبی اور ثقافتی مرکز بنایا۔ شجاع الدولہ کا زمانہ ۱۷۷۵ء تک رہا۔ پلاسی، پانی پت اور بکسر کی لڑائیوں میں حصہ لے کر انھوں نے اودھ کو ایک بار پھر ہندوستان کے نقشے پر نمایاں کر دیا۔'' [۲۵۵] نواب سراج الدولہ کی شہادت پر عظیم آباد کے صوبہ دار مہاراجہ رام نرائن موزوں (م: ۱۷۶۳ء) نے کہا تھا:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

موزوں نے چونکہ نواب سراج الدولہ کی عظیم آباد کی فوج کے ساتھ مدد کی تھی۔ جس بنا پر میر جعفر کے بیٹے میر قاسم نے اس سے عظیم آباد کی دیوانی اور رہتاس کی قلعداری لے کر اسے قید کر دیا اور بعد ازاں اس کے گلے میں ریت کا گھڑا باندھ کر گنگا میں ڈبو دیا۔ جب اسے کشتی میں بٹھا کر ڈبونے کے لیے لے جانے لگے تو اس نے کہا:

موذیوں کے قول پر ہرگز نہ کی جے اعتبار
جونک اگر مٹی ملے تو بھی لہو پیتی رہے
چادرِ تقدیر تو ہرگز رفو ہوتی نہیں
تا قیامت سوزنِ تدبیر گر سیتی رہے

بلبلِ بے درد کو مطلب ہے کیا پروانے سے
وصل میں مر جائے یہ وہ ہجر میں جیتی رہے

چونکہ دہلی کے حالات بھی کافی خراب ہو چکے تھے اور دیگر کئی علاقوں میں بھی طوائف الملوکی اور آئے دن کی جنگوں کے باعث حالات درست نہیں تھے۔ لہٰذا دہلی سے خاص طور پر نکلے ہوئے پریشان حال شاعر، فنکار، صناع، امراء، اودھ میں نئی بستیاں بسا رہے تھے اور دربارِ اودھ کو نیز عساکرِ اودھ کو علوم وفنون سے نمایاں کر رہے تھے۔ اس کے باوجود اودھ کی ثقافتی اور ادبی عظمت کے اصل معمار آصف الدولہ (۱۷۷۵ء۔۱۷۹۷ء) کو کہا جاتا ہے۔ جس نے فیض آباد سے ہٹ کر لکھنو کو ایک مرکز بنا دیا۔ جو دہلی کے برابر آ کھڑا ہوا۔ بعد ازاں نواب سعادت علی خان (۱۷۹۸ء۔۱۸۱۴ء) نے اسے مزید ترقی دی۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی نواب آصف الدولہ کے بعد تخت نشین ہوا۔ اسے انگریزوں کی مدد کے عوض نصف ملک ان کے حوالے کرنا پڑا۔[۲۵۶] سعادت علی خان علوم وفنون کے قدردان تھے انھوں نے جہاں فیض آباد کو ترقی دی۔ وہاں ادب کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ وہ نہ صرف شعراء کے قدردان تھے بلکہ خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ انگریزوں کے سامنے اس وقت سب سے بڑی رکاوٹ میسور کی سلطنت تھی جسے ٹیپو سلطان جیسا بہادر سپاہی چلا رہا تھا۔ انگریز جو کہ آہستہ آہستہ قدم جما رہے تھے اس سیسہ پلائی دیوار کو بھی گرانا چاہتے تھے لہٰذا:

> ''کمپنی سرکار اور نظام دکن نے یکم ستمبر ۱۷۹۸ء کو ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے اگر کوئی تیسری طاقت کمپنی یا نظامِ دکن پر حملہ آور ہوتی ہے۔ تو دونوں مل کر اس طاقت کا مقابلہ کریں گے اور صاف ظاہر ہے یہ ٹیپو سلطان کے خلاف ایک معاہدہ تھا لہٰذا ایک سب سیڈیری فوج (Subsidiary Force) قائم کی گئی۔ جو چار پلٹنوں (فی پلٹن ایک ہزار جوان)، ایک رجمنٹ (پانچ سو سواروں) اور توپ خانے پر مشتمل تھی اور جسے مملکت حیدر آباد میں متعین کیا گیا۔ اس فوج اور توپ خانے کا خرچ سالانہ بیس لاکھ ستر ہزار روپے تھا۔ اس پورے خرچ کی ادائیگی کی ذمہ داری نظام پر تھی لیکن فوج پر پورا کنٹرول انگریزی فوج کے افسروں کا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس فوج میں دو پلٹنوں اور ایک رجمنٹ کا

مزید اضافہ کر دیا گیا۔ ان تمام مصارف کے لیے نظام سرکار نے وہ تمام علاقے دواماً کمپنی سرکار کے حوالے کر دیے جو ۱۷۹۲ء اور ۱۷۹۹ء کی تیسری اور چوتھی جنگ میسور کے بعد انھیں ملے تھے۔'' [۲۵۷]

ٹیپو سلطان (۱۰ نومبر ۱۷۵۰ء-۴ مئی ۱۷۹۹ء) اپنے والد حیدر علی کے بعد ریاست میسور کے حکمران مقرر ہوئے۔ عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے۔ ابتدائی عمر میں نپولین کی طرح ٹیپو کو بھی فاضل بننے کا شوق تھا۔ اسے تلوار سے زیادہ قلم سے پیار تھا۔ اس کی نگاہ میں عالم کی دوات کی روشنائی خونِ شہدا سے زیادہ مقدس تھی لیکن ٹیپو کو آئندہ زندگی میں صاحبِ سیف بننا تھا اور میدانِ جنگ میں شہید ہونا تھا۔ [۲۵۸] حیدر علی نے ٹیپو کے علمی انہماک کو دیکھ کر کہا تھا جانِ پدر سلطنت کے لیے قلم سے زیادہ تلوار کی ضرورت ہے۔ [۲۵۹] اس فقرے نے ٹیپو سلطان کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ ادبی حوالے سے ٹیپو سلطان کے خطوط جس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ٹیپو سلطان کی کوئی اردو تحریر میری نظر سے نہیں گزری لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ اس نے اردو زبان وادب کے فروغ میں کوئی قابلِ قدر خدمات انجام نہیں دی ہوں گی۔ مرورِ زمانہ نے ممکن ہے کہ کوئی تحریر چھوڑی ہی نہ ہو۔ کیونکہ اس کی لائبریری بھی محفوظ نہیں رہی۔ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی لکھتے ہیں کہ:

''ٹیپو سلطان میں بے حد علمی ذوق پایا جاتا ہے۔ جس نے اس کے اندر مطالعہ کا شوق پیدا کر دیا۔ کتابیں اس کی رفیق تھیں۔ اس کے خطوط اس کی قابلیت اور صلاحیت اور باریک بینی کے آئینہ دار ہیں۔ کرنل کرک پیٹرک نے جس کے ذمہ بعد زوال سلطنتِ خداداد ٹیپو سلطان کا ذاتی کتب خانہ تھا۔ اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ: 'سلطان کی تحریر دوسروں کی تحریر سے بالکل علیحدہ تھی۔ اس کی تحریریں اس قدر مختصر اور پر معنی ہیں کہ ایک ایک لفظ سے کئی کئی معنی نکلتے ہیں۔' سلطان اعلیٰ نثر نگار اور باکمال شاعر تھا۔ علم سے ذاتی دلچسپی کی دلیل وہ اہم کتابیں ہیں جو ان کی نگرانی میں لکھی گئیں۔ ان میں متعدد مضامین اور اشعار خود سلطان کے ہیں۔ ٹیپو کے کتب خانہ کے نظم کے بارے میں میجر اسٹوارٹ اور پروفیسر آر۔ ایس گھوش لکھتے ہیں کہ کتب خانہ کی ترتیب

وتہذیب کے لیے ایک مہتمم مقرر تھا۔ سلطان کو تصنیف و تالیف کا بڑا شوق
تھا۔ سلطان کی قلم اور فرمائش سے متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر
فوجی اور دیوانی معاملات سے متعلق تھیں۔ سلطان کے فرامین یورپ کے
کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔" [۲۶۰]

ٹیپو سلطان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فارسی، کنٹر، اردو روانی سے بولتا تھا۔ اور اس کی عسکری جرأت اور بہادری کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ برطانوی گورنر لارڈ ولزلی نے جب ٹیپو کی شہادت کی خبر سنی تو خوش ہو کر کہا کہ اب ہندوستان ہمارا ہے۔[۲۶۱] سلطان ٹیپو دنیا کے وہ پہلے بادشاہ تھے۔ جن کے دور میں جوہری توانائی پر باضابطہ تحقیق کی گئی۔ اور جنگی میزائل کی ایجاد ہوئی جس کا استعمال سلطان نے جب جنگ میں کیا تو انگریز دنگ رہ گئے۔ ہندوستان کے سابقہ صدر ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے عبدالکلام جب میزائل ٹیکنالوجی پر ریسرچ کے لیے امریکہ گئے تو تب انھوں نے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے برآمدے میں ایک بادشاہ کی تصویر دیکھی جو اپنی فوج کو دشمن انگلستان کی فوج پر میزائل داغنے کا اشارہ دے رہا تھا۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ وہ ایک ہندوستانی بادشاہ تھا اور اس کا نام ٹیپو سلطان ہے۔ اس واقعے کا ذکر ڈاکٹر۔ اے۔ پی۔ جے عبدالکلام نے اپنی سوانح عمری "ونگس آف فائر" میں کیا ہے۔[۲۶۲]

ڈاکٹر عبدالکلام لکھتے ہیں:

"From LRC I went to the Goddard Space Flight Centre (GSFC)at Greenbelt, Maryland. This centre develops and manages mostof NASA's earth_ orbiting science and applications satellites. It operates NASA's tracking networks for all space missions. Towards the end of my visit, I went to the Wallops Flight Facility at Wallops Island in East Cost, Virginia. This place was the base for NASA's sounding rocket programme. Here, I saw a painting prominently displayed in the reception lobby. It depicted a battle scene with a few rockets flying in

the background. A painting with the theme should be the most commonplace thing at a Flight Facility, but the painting caught my eye because the soldiers on the side launching the rockets were not white but dark-skinned, with the racial features of people found in South Asia. One day, my curiosity got the better of me, drawing me towards the painting. It turned out to be Tipu Sultan's army fighting the British. The painting depicted a fact forgotten in Tipu's own country but commemorated here on the otherside of the planet. I was happy to see an India glorified by NASA as a hero of warefare rocket."[۲۶۳]

اردو کا پہلا اخبار جاری کرنے کا اعزاز بھی ٹیپو سلطان کو حاصل ہے۔اردو سے ان کی محبت اور اُردو زبان کے فروغ کے لیے کی جانے والی ان کی کوششوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''فوجی اخبار'' ٹیپو سلطان کی سرپرستی میں شائع ہوتا تھا۔ یہ انگریزوں کے سخت مخالف تھا اور میسور کے فوجیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔سرنگا پٹم کے سقوط کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔[۲۶۴] محمد حمید الدین انڈین آفس لائبریری میں موجود عہدِ ٹیپو سلطان میں لکھی گئی ایک کتاب میں سے اُردو کے رواج کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس دور میں فوجی غزلوں کے رواج کو بعید از قیاس نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ سرکاری زبان اگرچہ فارسی تھی لیکن ملک میں اردو خوب مروّج تھی اور سپاہیوں میں سے اکثر کی مادری زبان تھی۔انھوں نے ۱۳ ایسی غزلیں بھی اپنے مضمون میں نقل کی ہیں جو مختلف فوجی اوقات اور حرکات کے وقت گائی اور بجائی جاتی تھیں۔مثلاً ''غزل، وقت آہستہ قدم:

''ملکِ ہندوستان میں دیں کا وہی سلطان ہے   غرق جس کے آبِ خنجر میں فرنگستان ہے
کیا ہے نسبت جاہ و حشمت میں سکندر سیں تجھے   بارگاہِ قدر کا دارا ترا دربان ہے
ہے وہی انسان کامل جس میں ہو معنی کی بو
نقشِ دیبائی و گرنہ صورتِ انسان ہے

مذکورہ بالا غزل آہستہ روی کے وقت بجائی جاتی تھی۔

غزل در وقت سرور و فرحت

نہ دیکھے خواب میں روئے زوال اے ظلِ سبحانی
اگر خورشید سیکھے تجھے آئینِ جہانبانی

مجسّم ہو ترا گر حُسنِ خلق اے آیۂ رحمت
نکالے یک گریباں سے سراپا ماہِ کنعانی

الٰہی یہ شہِ انجم حشم گردش میں گردوں کے
نہ ہو خورشید کے مانند گاہے چیں بہ پیشانی [۲۵۵]

القصہ کہ ٹیپو سلطان کا ایک فقرہ ہزار ہا کتابوں پر بھاری ہے اور اردو کا یہ فقرہ ہے۔ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔'' ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جو عملاً دکھائی دیتا ہے کہ فرنگیوں کے سامنے اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ٹیپو کی شہادت کے ساتھ ہی فرانس کا بھی برصغیر میں خاتمہ ہو گیا۔ یورپین کی آمد سے اب تک مختلف اوقات میں جو عسکری باوردی شخصیات اردو کے فروغ اور اس زبان کے ارتقاء کے لیے سرگرداں رہیں ان میں سینکڑوں لوگوں کے نام گنوائے جا سکتے ہیں لیکن طوالت کے خوف سے چند نام درج ذیل ہیں۔ جنھوں نے اردو، انگریزی یا رومن کے ذریعے برصغیر کی مقامی زبان میں کام کرتے ہوئے انگریزوں کو اس زبان سے متعارف کروایا۔ یا اس زبان کو انگریزی سے متعارف کروایا۔ جن کے سبب یورپ میں یہ زبان (اردو) بولی اور سمجھی جانے لگی۔ کیپٹن الیگزینڈر ہملٹن، کرنل ایس ای ایبٹ، میجر جنرل لائیڈ، کیپٹن کک، کیپٹن ساریس، کیپٹن والٹر پیٹن، لیفٹیننٹ کرنل ٹاڈ، لیفٹیننٹ کرنل الیگزینڈر داؤ وھیلر، میجر راورٹی، لیفٹیننٹ کرنل میکنگ، لیفٹیننٹ کرنل ینگ، لیفٹیننٹ کرنل ڈاؤنٹن، لیفٹیننٹ میجر اولینڈرسن [۲۶۶] وغیرہ۔ لیکن ایک نام جو اگرچہ باقاعدہ فوجی نہیں تھا لیکن فوج میں بحیثیت ڈاکٹر ہندوستان میں ورود کے بعد اس نے خدمات انجام دیں۔ اُردو زبان کو اس کا صحیح مقام دینے اور دلانے میں اس شخص کا بڑا ہاتھ ہے۔ اور وہ شخص ہے گلکرسٹ (ڈاکٹر جان باتھ ورک گلکرسٹ) جس نے اپنا مدرسہ کھولا اور تعلیم کا آغاز کیا۔ پھر فورٹ ولیم کالج کے چار سالہ قیام میں تریسٹھ کتب تصنیف و ترجمہ اور تالیف کروائیں۔ [۲۶۷] نیز گلکرسٹ کی اپنی تصانیف کی تعداد گیارہ ہے۔ [۲۶۸] ان کے علاوہ اردو زبان کے فروغ میں وہ انگریز حکمران بھی شامل ہیں جو ۱۸۰۰ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے برِصغیر کے کسی نہ کسی خطے پر حاکم رہے۔ وہ

جنگوں کا حصہ بھی رہے۔اور خود اردو زبان سیکھنے اور اسے ترقی دینے کا بالواسطہ یا بلاواسطہ حصہ بھی رہے۔ان کے نام درج ذیل ہیں:

لارڈ کلائیو (۱۷۵۸ء۔۱۷۶۰ء،۱۷۶۵ء سے ۱۷۶۷ء)، جے زیڈ ہالول (۱۷۶۰ قائم مقام گورنر بنگال)،ایچ وینسارٹ (۱۷۶۰ء سے ۱۷۶۴ء)،ہنری ورلسٹ (۱۷۶۷ء سے ۱۷۶۹ء)، جون کارٹیئر (۱۷۶۹ء سے ۱۷۷۲ء)، وارن ہسٹینگز (۱۷۷۲ء سے ۱۷۷۵ء)،سر جون میکفرسن (۱۷۷۵ء قائم مقام گورنر جنرل)،کارنوالس (۱۷۷۶ء سے ۱۷۹۳ء اور ۱۸۰۵ء) سر جان شور (۱۷۹۳ء۔۱۷۹۸ء)،سر آلیورڈ کلارک (۱۷۹۸ء قائم مقام) ولزلی (۱۷۹۸ء۔۱۸۰۵ء)۔اس پر یہ اعتراض بجا ہے کہ ان لوگوں کا براہِ راست تعلق نہ تو فوج سے ہے اور نہ ہی اردو کے فروغ سے، تو اس صورت میں ان کے اسماء کا شامل کرنا چہ معنی دارد؟

اس ضمن میں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ جو حاکم وقت ہوتا ہے اور عوام سے جن کا تعلق ہوتا ہے۔ان کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ان کی مرضی اور منشا کے بغیر کوئی ایسا قدم اٹھانا بھی مشکل ہوتا ہے جو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکے نیز ایک گورنر یا گورنر جنرل اپنے عہد میں ماتحتوں کا کمانڈر بھی ہوتا تھا۔وہ دستے جو میدانِ جنگ میں کارآزما رہے۔وہ اپنے ان سربراہوں کے زیرِ کمان تھے۔ان لوگوں کے علاوہ ایسے لوگ بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے جنھوں نے اردو زبان کو اپنایا بھی اور اس میں اپنا نام بھی پیدا کیا لیکن ان شعراء وادبا کے بارے روایت کے لحاظ سے عسکری ہونے کا باقاعدہ ثبوت راقم کو میسر نہیں آسکا۔ہاں وہ کسی نہ کسی حیثیت سے فوج سے منسلک ضرور رہے۔خواہ میڈیکل کے شعبے سے خواہ تعلیم کے شعبے میں،خواہ پیشکار یا کسی اور شعبے کے حوالے سے۔البتہ انفرادی طور پر جنھوں نے اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے جو میری آنے والی کتاب کا ان شاءاللہ حصہ ہوگا۔

لارڈ ولزلی کو ۱۷۹۸ء میں جب ہندوستان میں گورنر جنرل مقرر کیا گیا تو اس کمی کو شدت سے محسوس کیا کہ ہندوستان میں ملازمت کے لیے مقیم برطانوی افسروں اور سپاہیوں کو یہاں کی مقامی زبان جو اردو ہے، سکھانا بھی ضروری ہے اور اس کے لیے کسی اچھی درسگاہ کا ہونا بھی لازم ہے۔لہٰذا اس نے کمپنی کے ملازمین کو اعلیٰ پیمانے پر تعلیم دلوانے کی غرض سے ایک طویل اور مدلل یادداشت لکھ کر کمپنی سے ایک کالج قائم کرنے کی اجازت چاہی اور پھر وقت ضائع کیے بغیر جولائی

۱۸۰۰ء کو کالج کا افتتاح کر دیا۔لیکن ٹیپو سلطان کی شہادت کے دن کے باعث اندراج ۴ مئی ۱۸۰۰ء کیا گیا۔لارڈ ولنرلی اس میں ایشیاء کی زبانوں کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہتا تھا لیکن اردو میں نثر مفقود ہونے کی وجہ سے ایک ادارہ سررشتۂ تالیف وترجمہ قائم کیا گیا۔اور نثر میں کتابیں لکھوائی گئیں۔

۸۔لوٹ پیچھے کی طرف

مغلوں کے دورِ حکومت میں یا اُن سے پہلے اور متوازی کچھ ایسے ادارے یا عہدے بھی رہے ہیں۔جن کے بارے میں دو رائے پائی جاتی ہیں۔ایک تو یہ کہ وہ فوج کا حصہ تھے اور دوسری رائے یہ کہ وہ فوج کا باقاعدہ حصہ نہیں بالکل ایسے ہی جیسے آج کل آرڈیننس ڈپو، یا ای ایم ای ورکشاپس یا ایسے دیگر اداروں میں کام کرنے والے سویلین، M.E.S، آڈٹ یا فوجی اداروں سے منسلک سویلین ادارے یا لوگ جو جنگ میں عملاً حصہ نہیں لیتے یا فوجی وردی پہننے کا جن کو اختیار نہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں منشی یا میر منشی، تنخواہیں تقسیم کرنے والے، متصدی، اصطبل کے داروغہ وغیرہ یا داروغہ یا میر نعمت یعنی باورچی وغیرہ وہ لوگ تھے جن کے بارے میں دو رائے موجود ہیں۔لہٰذا ایسے لوگ اگر مستقل یا باقاعدہ عساکر کے زمرے میں نہیں آتے تو کم از کم ان کا ایک تعلق فوج سے تھا تو سہی۔لہٰذا ایسے لوگوں کو خارج از بحث سمجھنا بھی ان کے ساتھ زیادتی ہے اور انھیں مستقل یا باقاعدہ فوج کا حصہ سمجھنا دوسروں کے ساتھ زیادتی ہے لیکن ایسے لوگوں میں سے جنھوں نے باقاعدہ کسی جنگ میں حصہ لیا یا حصہ لینے کے مجاز تھے نیز جنگ میں جانیں بھی دیں انہیں شامل نہ کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہے۔بہر حال ایسے اشخاص میں سے راجا رام جن کا تعلق گجرات سے تھا اور اردو کے معتبر شعراء میں شمار ہوتے ہیں، جیسے اردو کے خادم مقالے کا مختصر حصہ بنائے جا سکتے ہیں۔

لعل سب آئے یہاں کانِ بدخشاں سے نکل	تجھ لبِ رنگیں کا شہرہ سُن کے وے خورشید رہ
ناگ لے آتے ہیں من ملکِ سلیماں سے نکل[۲۶۹]	شام میں تجھ زلف کے دنداں سمجھ کر شب چراغ

محمد بلاقی خاکسار کے بارے میں لکھا جاتا ہے کہ سپاہی وضع تھے یہ اس شک میں مبتلا کر دیتا ہے کہ ان کی وضع قطع تو سپاہیوں جیسی تھی لیکن سپاہی نہیں تھے۔یا یہ گمان بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ تب سپاہیوں کے بارے تذکرہ نگار اتنا لکھ دینا ہی کافی سمجھتے تھے کہ سپاہی وضع ہیں۔انھوں نے شاہ عالم ثانی کا زمانہ پایا تھا اور اردو شاعری میں اپنا حصہ ڈالا۔

کیا تیغ ابرو سے مجھ کو شہید ۔۔۔ یہ کیا خوب جوہر دکھا کر چلے
دکھا ساقِ سیمیں تو اب شمع کو ۔۔۔ رولا کر، گلا کر، جلا کر چلے [۲۷۰]

فوج میں جوان کا لفظ ایک سپاہی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور بہت سے سپاہیوں کے لیے یہ لفظ تذکرہ نگاروں نے استعمال کیا ہے۔ جیسے میاں محمد علی المتخلص بہ بیدار جوان محمد شاہی است از شاگردانِ مرتضٰی قلی بیگ کہ ۔۔۔فراق تخلص مے نمود:

صفا الماس و گوہر سے فزوں ہے تیرے دنداں کو
کیا تجھ لب نے ہم رنگِ خجالت لعل و مرجاں کو
چھوڑ کر کوئے بتاں جاتا ہے تو کعبہ کو
جلد پھریو تجھے بیدار خدا کو سونپا [۲۷۱]

اللہ وردی خان جلیس جو سعادت یار خان رنگین کے چھوٹے بھائی تھے بھی ''مرد سپاہی وضع مؤدب کم گو'' تھے۔

تیرے دہن سے از بس کھینچے ہے اک خجالت
غنچہ وہ کون سا ہے جو سرخرو نہ آیا
چشمِ جلیس کو اب درکار تھا یہ سرمہ
دستِ صبا تو لے کر اس خاک کو نہ آیا [۲۷۲]

عبد الصمد شیفتہ اہلِ علم خاندان سے اور سپاہی قسم کے آدمی تھے اور بھورے خان آشفتہ کے شاگرد تھے۔

بے سبب کاکلِ مشکیں کو یہ شانہ کیا تھا
منہ چھپانا تھا اگر تو یہ بہانہ کیا تھا [۲۷۳]

میر تقی میر کو اگر میں سپاہیوں کے زمرے میں شامل کرتا تو کوئی بھی استادِ فن ماننے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ''نول سنگھ کی فوج کے ساتھ دہلی آنا ہوا اور پھر بہادر سنگھ کے ہمراہ لشکر شاہی کے ساتھ مرہٹوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔'' [۲۷۴] میر نے روزنامچے اور ذکرِ میر میں جس طرح جنگوں کا، دہلی کا، فوجوں کی روانگی کا، مرہٹوں کا، شجاع الدولہ کا اور میدانِ جنگ وغیرہ کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ جنگ میں ان کی شمولیت ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ نیز آپ نے

''۱۱۶۰ھ میں رعایت خان کی ملازمت'' بھی کر لی تھی۔[۲۷۵] ۱۱۶۲ھ میں ایک معمولی سے واقعے پر اسے چھوڑ دیا۔ اسد یار خان جو اس کی فوج کا بخشی تھا' نے میر کے احوال سن کر گھوڑے اور نوکری کی تکلیف معاف کر دی تھی۔[۲۷۶] ۱۱۶۳ھ میں اسحاق خان نجم الدولہ کے ساتھ فرخ آباد گیا اور اس ہارے ہوئے لشکر کے ساتھ بڑی زحمت اٹھا کر پھر شہر (دلی) واپس آیا۔[۲۷۷] جب سکھر تال کا معرکہ ہوا تو میر تقی میر شاہی لشکر میں شامل تھے۔ ایک سال بعد یہ لشکر واپس آیا تو یہ بھی لشکر کے ساتھ واپس آ گئے۔[۲۷۸] اگرچہ اس طرح میر تقی میر کے حالات میں اس کا میدانِ جنگ میں ہونا ثابت ہے لیکن یہ کہیں نہیں تحریر کیا گیا کہ وہ سپاہی تھے یا فوج کے ساتھ ان کا باقاعدہ تعلق تھا۔

میر تقی میر ایک پر گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تذکرہ نگار اور سوانح نگار بھی تھے مگر آپ کی سوانح فارسی میں اور تذکرہ بھی شعراء کے کلام کے علاوہ فارسی میں ہے لیکن اردو میں بھی آپ کی خدمات اتنی زیادہ ہیں کہ جب تک اردو زبان زندہ ہے آپ کو بھلانا ناممکن ہے۔ آپ نے اُردو میں چھ دیوان مرتب کیے جن میں مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، قطعہ، رباعی، مثلّث، واسوخت، مسدس، مخمس، غرض ہر صنفِ سخن میں شاعری کی۔ لیکن غزل آپ کا اصل میدان ہے۔ اس صنف میں میر نے ذاتی واردات سے کائناتی تجربے کی اور انسانی کرب کو تخلیقی کرب کی صورت دی ہے۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

تلوار غرقِ خوں ہے آنکھیں گلابیاں ہیں
دیکھیں تو تیری کب تک یہ بدشرابیاں ہیں

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

منشی جگناتھ خوشتر کے بارے میں لالہ سری رام لکھتے ہیں کہ متصدی گری پر فائز تھے۔

خوشتر کی تصانیف میں منظوم رامائن، شری بھاگوت اور چتر گپت مشہور ہیں۔

جفا پیشہ، ستم گر فتنہ خو ہے　　　برائے رنج ہر کس حیلہ جو ہے

اگر چہ پیر ہے لیکن ہے بے پیر ہمیشہ منقلب ہے اس کی تدبیر [۲۷۹]

مکند سنگھ یا مکند لال فارغ دہلوی بھی متصدی کے زمرے میں آتے ہیں۔ دہلی میں پیدا ہوئے لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد بریلی میں سکونت اختیار کر لی۔ صاحب دیوان تھے۔

جلا ہے سینے میں دل شمع وار ساری رات
رہا ہے آنکھوں سے اشکوں کا ہار ساری رات
بتاں کے غم میں پلک سے پلک نہیں لگتی
کیا کریں ہیں ستارے شمار ساری رات [۲۸۰]

عبدالحلیم شاہ حلیم امروہہ کے شیوخِ عباسی میں سے تھے۔ آغازِ جوانی میں وطن سے نکل کر جے پور پہنچے اور بعہدۂ متصدی محکمۂ فوج میں ملازم ہو گئے۔

نہ جفاؤں سے شکایت نہ وفا سے مطلب
اس کے طالب کو ہے تسلیم و رضا سے مطلب
اللہ ہے خود رفتگی اتنا بھی نہیں ہوش
خم منہ سے لگا لیتے ہیں پیمانہ سمجھ کر [۲۸۱]

شیخ شمس الدین سوزاں جو میر سوز کے شاگرد اور فرخ آباد کے رہنے والے تھے وہ بھی مردِ سپاہی وضع کہلائے جس سے یہ تسلّی کرنا کہ ان کا تعلق فوج سے تھا مشکل ہے۔ اردو زبان کے فروغ میں ان کا اپنا کردار ہے۔

ہر دم مجھے دھمکاتے ہو تلوار پکڑ کے
جاؤ! کہیں گھر سے تو نہیں آئے ہو لڑ کے
اس کے کوچہ میں نہیں ہم کو کسی کا خطرہ
پھر خفا وہ نہ ہو آتا ہے اسی کا خطرہ [۲۸۲]

شیخ پیر محمد فنا فنونِ سپہگری سے خوب آشنا، شاگرد میر تقی میر تھے۔

کیوں نہ کہیے گیسوؤں کو اس کے جوڑا سانپ کا
صاف دونوں میں اثر ہے تھوڑا تھوڑا سانپ کا
پیچ سے نکلا نہ دل ہرگز تمہارا زلف کے

سب پڑھے باقی کوئی منتر نہ چھوڑا سانپ کا[۲۸۳]

شیخ عوض علی تنہا کے حوالے سے بھی یہی تحریر سامنے آتی ہے کہ سپاہی منش اور آزاد آدمی تھے۔ منش اگرچہ آدمی کے معنی میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کا غلط مطلب صورت وغیرہ بھی لیا جاتا ہے۔ صاحبِ خم خانۂ جاوید نے شیخ تنہا کے تین اشعار درج کرنے کے علاوہ مزید معلومات سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔:

کیا بلا پھونکی ہے سوزِ عشق سینے میں مرے
آہ کا شعلہ جو نکلے ہے سو آتش بار ہے
ان بتوں کو کیا ادا تو نے عنایت کی خدا
جو نگہ ترچھی پڑی برچھی سی دل کے پار ہے[۲۸۴]

مولانا کفایت علی کافی اگرچہ باقاعدہ یا بے قاعدہ فوج کا حصہ نہیں رہے لیکن ۱۸۵۷ء میں مراد آباد میں جن بزرگوں نے جہادِ آزادی میں حصہ لیا ان میں مولانا کفایت علی پیش پیش تھے۔ آپ نے فتویٰ جہاد جاری کر کے اس تحریک میں ایک نئی روح پھونکی۔ آپ کی مثنوی ''تجلّی دربارِ رحمت'' نے ادب میں پذیرائی پائی۔ آپ کی نعت کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

دیکھتے جلوۂ دیدار کو آتے جاتے
گلِ نظارہ کو آنکھوں سے لگاتے جاتے
پائے اقدس سے اٹھاتے نہ کبھی آنکھوں کو
روکنے والے اگر لاکھ ہٹاتے جاتے [۲۸۵]

منشی خیراتی لال شگفتہ کے بارے میں بھی ابہام ہے کیونکہ منشی طوطا رام کا یہ بیٹا لکھنؤ کا باسی، نسیم دہلوی کا تلمیذ، فنِ شاعری اور سپہ گری میں استاد مانا جاتا تھا۔ نیز صاحبِ دیوان اور صاحبِ تلامذہ تھا۔

ادب بخشا ہے ایسا ربط الفاظ مناسب نے — دو زانو ہے مری طبع رسا ترکیب اردو سے
اٹھا نہ گر کے کبھی فرش خاک سے ہرگز — مری طرح مرا آنسو بھی نا تواں ٹھہرا[۲۸۶]

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے غدار شعراء میں راولپنڈی کے سردار محمد حیات خان کا ذکر ان الفاظ میں آتا ہے۔ سپاہیانہ اوصاف کے حامل تھے اور محاصرۂ دہلی کے وقت خدماتِ جنگی میں

زخمی بھی ہوئے۔

بہت کی جستجو دیر و حرم میں   نہیں پایا کہیں مسکن کسی کا
سراپا آتشیں پیکر بنا دل   چھپاؤں اب کہاں سوزِ نہاں کو[۲۸۷]

اودھ پنچ کے مدیر سجاد حسن یا حسین کے بارے میں مرقوم ہے کہ فوج میں اردو پڑھانے پر متعین ہوئے۔ ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کی بنیاد رکھی۔ ''سید سجاد حسین کی تحریر میں آزادخیالی، بے باکی اور صاف گوئی ہے۔ روزمرہ اور ضرب الامثال و تمثیلات کی چاشنی ہے۔''[۲۸۸]

جس دور کی بات ہو رہی ہے اس وقت فوج میں دو طرح کے اساتذہ ہوا کرتے تھے۔ ایک تو وہ ہوتے تھے جو باقاعدہ فوج کا حصہ ہوتے اور یونیفارم، پروموشن وغیرہ سب سہولتوں کے حامل ہوتے۔ جب کہ دوسرے وہ لوگ ہوتے۔ جو بحیثیت سول اساتذہ پڑھاتے تھے۔ کسی بھی ناقد یا محقق نے سجاد حسین کے بارے میں یہ نہیں لکھا کہ وہ اساتذہ کی کس قسم سے متعلق تھے۔ باقاعدہ اساتذہ آج کل آرمی ایجوکیشن کور کا حصہ ہوتے ہیں۔

دیوانِ جانی بہادر لال جی راضی بھی ۱۸۴۶ء میں پلٹن نمبر ۶۲ میں میر منشی ہو کر سات برس تک بنگالہ، ڈھاکہ، کلکتہ، الٰہ آباد اور اٹاوہ میں رہے۔ ان کی زود گوئی اور پر گوئی قابلِ تعریف ہے۔

کروں شکوہ میں کیا اس شوخ کی نا مہربانی کا
دمِ رخصت دیا مجھ کو نہ اک چھلا نشانی کا
جس سے جیتے جی پایا تھا مرے گھر نے شرف
شکر ہے اس سے جنازہ کا تجمل ہو گیا[۲۸۹]

نواب مرزا داغ کا نواب کلب علی خان کے ہاں داروغۂ اصطبل ہونے کا کوئی بھی طالبِ ادبِ اردو انکار نہیں کرسکتا۔ ہاں یہ ضرور اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ داروغہ اور اصطبل دونوں الفاظ اس کے عسکری ہونے کو ظاہر نہیں کرتے۔ لیکن کیا اصطبل کا تعلق فوج سے نہیں تھا؟ یہ بھی سوال سامنے آتا ہے۔

رنج کی جب گفتگو ہونے لگی   آپ سے تم، تم سے تو، ہونے لگی
نا امیدی بڑھ گئی ہے اس قدر   آرزو کی آرزو ہونے لگی[۲۹۰]

چھیتر مل مجبور بھی جے پور کے بخشی خانۂ فوج میں ملازم تھے۔ شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔

غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن پر بھی طبع آزمائی۔ تحقیق ہے کہ ان کا ضخیم دیوان تھا۔

شکایت اپنی خرابی کی تو نہ کر مجبور
کیے ہیں عشق نے برباد خانماں کیا کیا
دیکھ آیا ہے تری بحث کو پھر ابرِ بہار
ہاں ذرا دیدۂ تر تو بھی گہر بار تو ہو[۲۹۱]

محمد یوسف علی خان عزیزؔ بھی جے پور کے محکمۂ بخشی خانہ فوج میں ملازم رہے۔ اردو ادب کے فروغ میں ان کی خدمات گراں قدر ہیں۔ درجنوں کتب کے مصنف تھے جن میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ نظام الادب
۲۔ خلاصۃ القواعد
۳۔ اسوۂ حسنہ
۴۔ اعتمادِ محمود
۵۔ تصویرِ شہادت
۶۔ تاریخِ افتراقِ اسلام
۷۔ مرثیہ کی نئی دنیا
۸۔ نور القرآن
۹۔ خاکِ شفا
۱۰۔ صداقتِ عزیز
۱۱۔ نورِ مبین
۱۲۔ قیامتِ صغریٰ
۱۳۔ معین الادب
۱۴۔ محی الادب
۱۵۔ مجموعہ مسمط و رباعیات
۱۶۔ قومی نظموں کا مجموعہ
۱۷۔ تاریخِ اتحادِ اسلام
۱۸۔ قیامت وسطیٰ
۱۹۔ خیر الخلائق
۲۰۔ دینِ عزیز
۲۱۔ شاہکار عزیز وغیرہ۔

جب جہل بتاتا ہے جفا کی راہیں
جب علم سکھاتا ہے ریا کی راہیں
جب عقل کو خوش آتی ہے سہل انگاری
تو عشق سکھاتا ہے وفا کی راہیں [۲۹۲]

ایسی بے شمار شخصیات ہیں جنھوں نے عساکر میں کسی نہ کسی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں اور ساتھ ہی اردو زبان و علم و ادب کے فروغ اور ارتقا کے لیے بھی سرگرمِ عمل رہے۔ اس میں صرف برصغیر کے لوگ ہی نہیں یورپین کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے اہلِ قلم کے نام اگر شمار کیے جائیں تو ایک مقالہ سے الگ مقالہ کی ضرورت پڑے گی۔ ان کے علاوہ بہت سی ایسی شخصیات جنھوں نے دونوں شعبوں میں اپنا کردار ادا کیا۔ لیکن وائے قسمت کہ راقم ان کے

حالات سے اور ادبی کام سے آگاہی کے حصول سے قاصر رہا۔ ممکن ہے کہ کل کا کوئی مؤرخ یا سکالر ان عسکری اہلِ قلم کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو جائے۔

۹۔ ایک قدم آگے

اُردو زبان وادب کی تاریخ کا سفر جب بیسویں صدی میں داخل ہوتا ہے۔ جغرافیائی نقشے بھی اتھل پتھل ہوتے ہیں۔ زبانوں میں بھی تغیّر پیدا ہوتا ہے۔ آزادی کی لہر دوڑتی ہے تو علاقائی سطح پر زبان پر بھی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایسے حالات میں بھی اگر چہ عساکر تو اپنے ہر دو محاذوں پر یعنی جغرافیائی اور لسانی، اپنی خدمات انجام دے رہے ہوتے ہیں، کچھ ایسی شخصیات بھی زبان وادب کی خدمت میں ممد ومعاون دکھائی دیتی ہے جن کے بارے میں وہی مسائل سامنے آتے ہیں، جو قبل ازیں زیرِ بحث آچکے ہیں۔ ان شخصیات کا تعلّق بھی کسی نہ کسی طرح عساکر سے ہوتا ہے۔ ایسے اہلِ قلم میں اگر چہ بہت سے لوگ شامل ہیں لیکن چند ایک کا ذکر ضروری ہے جو تقسیمِ ہند سے قبل کسی نہ کسی حوالے سے فوج سے منسلک رہے اور کچھ عرصہ خدمات کی ادائیگی کے بعد الگ ہو گئے۔ ان میں محمد نور احمد تنویر (۱۸۷۴ء۔۱۶ ستمبر ۱۹۵۵ء) جے پور کے محکمہ بخشی خانہ فوج میں ملازم رہے۔ بعد ازاں کئی دیگر اداروں میں بھی خدمات انجام دیں۔

ہمیں نہ چھیڑ کسی اور کو نصیحت کر	بُرا ہے ناصحِ ناداں معاملہ دل کا
حاصل ہوئی یہ بات مجھے ضبطِ آہ میں	میں ہو گیا عزیز کسی کی نگاہ میں[۲۹۳]

سید محمد صادق علی جعفری متخلّص بہ زاہد/صادق دہلوی (۱۸۹۵ء۔۱۹۶۳ء میں زندہ تھے) جھانسی بریگیڈ میں فوجی انگریز افسروں کو اردو اور فارسی پڑھایا کرتے تھے اور جہاں انگریزی پلٹن جاتی تھی آپ کو اس کے ساتھ جانا پڑتا تھا۔ تاریخ گوئی میں آپ طاق تھے۔

ہر ایک سمت فضاؤں میں شورشِ غم ہے	مٹا رہا ہے زمانہ یہ کس کا ماتم آہ
کھلا جو راز کہ شاہِ ولی محمد نے	خوشی سے چھوڑ کے ہستی کو لی عدم کی راہ
تو یہ خیال نے تاریخ دی مجھے صادق	گئے ہیں خلد کو سید ولی محمد شاہ[۲۹۴]

نواب بہادر یار جنگ المتخلّص خلّق تحریکِ آزادئ ہند کے ایک شعلہ بیان مقرر اور محرک کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آپ شعر وسخن سے بھی شغف رکھتے تھے۔ سید تسکین عابدی نے انکشاف

کیا ہے کہ ''محمد بہادر خان نواب بہادر، یار جنگ بہادر نواب نصیب یار جنگ بہادر مرحوم کے فرزند اور قدیم جاگیردار اور جمعدار ہیں۔'' [۲۹۵] دراصل جمعدار کا عہدہ انگریزوں کے عہد میں آج کی فوج کے نائب صوبیدار کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ جب کہ ٹیپو سلطان کی فوج میں حوالدار کے لیے اسے استعمال کرتے تھے۔ چونکہ بہادر یار جنگ کے حوالے سے میں نے کسی اور تصنیف یا تذکرہ میں نہیں پڑھا۔ اس لیے اس عہدہ کی تصدیق کرنا مشکل ہے۔

ساقی کا اپنے سب پہ برابر کرم رہا
بٹتی رہی ہے سب میں برابر شرابِ علم
کیوں زیر و بم سے خالی فضائے کمال ہے
کیا تیرے ہاتھ ہی کے لیے تھا ربابِ علم [۲۹۶]

اُردو ادب میں طنز و مزاح کے حوالے سے ظریف جبلپوری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں وہ محکمہ دفاع میں ٹائپسٹ تھے۔ [۲۹۷] بات یہیں نہیں رکتی۔ محکمہ دفاع کی کئی جہتیں ہیں جس میں سے ایک فوج ہے اگر وہ فوج میں تھے تو کس نوعیت کے تھے۔ سویلین کلرک تھے۔ یا کسی یونٹ میں باقاعدہ (کلرک) ٹریڈ تھا۔ ''فرمانِ ظرافت'' دیوان کے تخلیق کار اس شاعر کے بارے میں بھی مزید کچھ مواد نہیں مل سکا۔ لیکن ان کی اردو زبان و ادب کی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

کاغذ کی کمی نوٹوں کی کثرت سے ہے ظاہر
یہ راز ہے جو ہم کو بتایا نہیں جاتا
کچھ ایسے جوش میں سر بہرِ سجدہ ہم نے دے مارا
کہ دروازے کو کھدوانے پہ مشکل سے جبیں نکلی

حاجی محمد حسین کنجاہی کے بارے میں بھی اسی طرح کا ابہام ہے کہ تعلیم سے فارغ ہوئے تو فوج میں اکاؤنٹینٹ بھرتی ہو گئے۔ [۲۹۸]

اکاؤنٹینٹ میں ملٹری اکاؤنٹ کا ادارہ بھی آتا ہے۔ جس میں آڈیٹر وغیرہ ہوتے ہیں۔ یونٹوں میں بھی ایک کلرک باقاعدہ عسکری ہوتا ہے جو یونٹ کے اکاؤنٹ کو ڈیل کرتا ہے۔ میسوں پر اخراجات اور آمدن کی دیکھ بھال کے لیے اکاونٹ کلرک ہوتا ہے۔ سنٹرز میں اکاؤنٹ آفیسر ہوتا ہے۔ حاجی محمد حسین کنجاہی کون سے اکاؤنٹینٹ تھے یہ صدیق مجاہد بھی بتانے سے قاصر ہے۔ البتہ

اردو اور فارسی زبان میں ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حیرت جالپوری کے بارے میں کچھ اسی قسم کا ابہام پایا جاتا ہے کہ فوج میں اکاؤنٹینٹ تھے جماعت کی وجہ سے ملازمت ترک کر دی۔[۲۹۹] اُردو ادب کی خدمات میں ''شمشیرِ قلم'' آپ کا شعری مجموعہ تو ہے ہی، لیکن تقاریر کا مجموعہ ''اعجازِ نطق'' کسی صورت فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً اس کا مقدمہ جو بڑا فاضلانہ اور حیرت انگیز ہے علامہ محمد اقبال کی نذر کیے گئے اشعار میں لکھتے ہیں:

بنائے عشق تری لا الہ الا اللہ

کہ تو ہے جلوۂ توحید کا شہید و قتیل

بتایا تو نے ہمیں عشقِ مصطفیؐ کا مقام

کہ جن کی ذات پہ نازاں ہے ذاتِ رب جلیل[۳۰۰]

صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم (۴ راگست ۱۸۹۹ء۔ ۷ فروری ۱۹۷۸ء) جنھیں اردو، پنجابی اور فارسی ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے اور جن کی ۲۵ سے زائد تصانیف تشنگانِ علم و ادب کی پیاس بجھانے کا سبب ہیں۔ آپ کے بارے میں بھی واضح طور پر یہ حوالہ نہیں ملتا کہ فوج میں آپ کس حیثیت سے شامل ہوئے تھے۔ مقالہ نگار بھی اتنی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ حقائق تک پہنچا جائے۔ سوانحی انسائیکلوپیڈیا کا مقالہ نگار رقم طراز ہے کہ ایم اے کرنے کے بعد آرمی میڈیکل کور میں ملازم ہو گئے۔[۳۰۱]

ایم اے کرنے کے بعد اس دور میں آرمی میڈیکل کورس میں جانا میری سمجھ سے بالا ہے۔

کرب و آلام کے طوفانوں سے ٹکراتے ہوئے

زندہ لاشوں کے مزاروں سے گزر آئے ہیں

اپنے من کی بات سنو اور اپنے دل سے راز کہو

اپنا اپنا غم کھاؤ اور اپنا اپنا درد سہو

ان کڑی راہوں میں ایسے بھی مقامات آئے

جستجوؤں کو سفر گاہوں کی راہیں نہ ملیں [۳۰۲]

اس پر میرے اصل مقالے میں تفصیل سے بحث ہوئی ہے جبکہ راقم کی کتب ''اُردو ادب اور عساکرِ پاکستان'' (تین جلدیں) بھی اس موضوع کی عکاس ہیں۔

روایت کا یہ سلسلہ خاصا طویل ہے اور عام طور پر جیسے سمجھا جاتا ہے کہ فوج میں ادب لکھنے اور پڑھنے والوں کا فقدان ہے بالکل غلط ہے۔ اگر دنیائے ادب کا مطالعہ کریں تو اخناتون، سقراط، افلاطون، زینوفن سے لے کر نٹشے ہیمنگوے، ایذرا پاؤنڈ، حاجی لق لق، وقار انبالوی، چراغ حسن حسرت، فیض احمد فیض، عتیق صدیقی، قمر صدیقی، ضمیر جعفری اور دورِ حاضر تک تمام باکمال ادیب کسی نہ کسی حوالے سے فوج سے منسلک ملیں گے۔

اگرچہ روایت کو ابتدا سے لے کر چلنے اور نبھانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن فوج / عساکر کا اردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقا میں جو حصہ ہے اسے کبھی اجاگر کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ خدا جانے جمہوری لوگوں کو اپنی ہی فوج سے کس قسم کا بیر ہے۔ خاص کر تیسری دنیا کے جمہوریت کے دعوے دار سیاست دان اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اس سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یا تو طاقتور حکومتوں کے ایما پر ایسا کیا جاتا ہے یا پھر ملک کے دفاع کو کمزور کر کے۔۔۔ (خدا نہ کرے)

☆☆☆

حواشی وتعلیقات

۱۔ ''اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ''، جلد نمبر ۱۰، دانش گاہِ پنجاب، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۲۵۳

۲۔ کلامِ مقدس کا عہدِ عتیق، بابِ تکوین، ۴: ۱۷

۳۔ کلامِ مقدس کا عہدِ عتیق، بابِ تکوین، ۵: ۳۔۴۔۵

۴۔ ابنِ کثیر، ''قصص الانبیاء''، مترجم: مفتی محمد فیض احمد اویسی، زاویہ پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۵۸

۵۔ کیونکہ آپ پہلے رسول تھے اور آپ سے رُشد و ہدایت کا سلسلہ شروع ہونا تھا لہٰذا ضروری تھا کہ آپ پر کوئی نوشتہ اتارا جاتا جس سے آپ تبلیغ کے عمل کو جاری رکھتے اور آگے بڑھاتے۔

۶۔ ابنِ کثیر، ''قصص الانبیاء، ص ۷۸

۷۔ عبدالرحمان، علامہ ابنِ خلدون، تاریخ ابنِ خلدون (قبل از اسلام، اوّل۔دوم) ترجمہ: حکیم احمد حسین الہ آبادی، نفیس اکاڈمی، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۹

۸۔ روبینہ نازلی، علم الانسان، یورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۲۷

۹۔ عبدالعزیز ہزاروی، مولانا، ''تذکرۃ النبیّین''، پرنٹنگ محل کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۷۰

۱۰۔ القرآن، البقرۃ، ۳۰ تا ۳۳

۱۱۔ القرآن، العلق: ۳ تا ۵

۱۲۔ القرآن، البقرۃ: ۲

۱۳۔ القرآن، القلم: ۱

۱۴۔ ابنِ کثیر، حافظ عماد الدین، ابو الفدا اسماعیل، تاریخ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ) جلد اوّل۔حصہ اوّل، ترجمہ: مولانا ابو طلحہ محمد اصغر مغل، دارالاشاعت کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۱

۱۵۔ القرآن، الانفال: ۶۰

۱۶۔ القرآن، العادیات: ۱ تا ۵

☆ مخالفین کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید کا نزول تو حضور نبی مکرم حضرت محمد ﷺ پر تخلیق آدم سے ہزاروں سال بعد میں ہوا تو ان آیات کو حضرت آدم کے عہد پر منطبق کیسے کیا

جاسکتا ہے۔اس سلسلے میں عرض ہے کہ قرآن کی تحریرات اور تعلیمات حضرت آدمؑ سے قیامت تک کے تمام زمانوں پر محیط ہیں۔دین کی ابتداء حضرت آدم سے ہوئی اور حضور نبی کریم ﷺ پر آ کر اس دین کی تکمیل ہوئی اور اس کا نام اسلام رکھا گیا۔یہ حقیقت بھی ہمیں قرآن مجید سے پتہ چلی۔لہٰذا جہاں تک دین کی حد ہے، وہاں تک قرآن کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔

۱۷۔ کلامِ مقدس کا عہدِ عتیق، بابِ تکوین: ۴: ۲۱۔۲۲

۱۸۔ رما شنکر ترپاٹھی، ''تاریخ قدیم ہندوستان''، مترجم: سید سخی حسن نقوی، سٹی بک پوائنٹ کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۲۰

۱۹۔ وہاب اشرفی، پروفیسر، ''تاریخِ ادبیات عالم''، جلد اول، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۳۳، ۳۴

۲۰۔ کلامِ مقدس کا عہدِ عتیق، باب تکوین، ۵ آدم کا نسب نامہ

۲۱۔ القرآن، یٰسٓ: ۱۲

۲۲۔ شایاں بریلوی، ''تاریخ شعرائے روہیلکھنڈ''، جلد اول، سید عظیم القدر کراچی، ۱۹۹۱ء، ص ۲

۲۳۔ فضل احمد جیبی، میاں، میلاد النبی کے کیلنڈر کا پس منظر، مشمولہ: سہ ماہی عقیدت، سرگودھا، شمارہ ۳، جولائی، ۲۰۰۵ء، ص ۳۹

۲۴۔ القرآن، التین: ۴

۲۵۔ القرآن، الروم: ۳۰

۲۶۔ القرآن، البقرہ: ۶۵، الاعراف: ۱۶۶

۲۷۔ آئزک ایسی موف، ''علم اور سائنس کا سفر''، مترجم: محمد ارشد رازی، مشعل بکس لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۴

۲۸۔ ابنِ کثیر، ''قصص الانبیاء''، ص ۱۷

۲۹۔ ضیا تسنیم بلگرامی، سوانح انبیاء، جلد اول، کتابیات پبلی کیشنز، کراچی، س ن، ص ۷

۳۰۔ راقم نے ۱۹۹۶ء میں اس مزار پر حاضری دی تھی۔

۳۱۔ زمان کھوکھر، ایم، ''گجرات تصاویر کے آئینے میں'' یاسر اکیڈمی گجرات، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۰۰ء، ص ۳۸

محمد زمان کھوکھر نے بعد میں بعنوان ''حضرت قنبیط'' ایک کتاب بھی لکھی جس میں اس عہد کے تمام احوال بیان کیے نیز یہ بھی لکھا کہ مزار کی نشاندہی حافظ شمس الدین گلیانویؒ نے کی جو علم کشف القبور کے ماہر اور درویش منش تھے۔

۳۲۔ احمد حسین قریشی قلعداری، ڈاکٹر، ''ضلع گجرات، تاریخ۔ ثقافت، ادب''، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور ۱۹۹۵ء، ص ۴۵

۳۳۔ سموئیل جے شلٹز، ''عہد عتیق کا تاریخی سفر''، مترجم: جیکب سموئیل شنوا، مسیحی اشاعت خانہ، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۳۶۔۳۷

۳۴۔ سجاد حیدر پرویز، ڈاکٹر، ''مختصر تاریخ زبان و ادب سرائیکی''، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۶

۳۵۔ شایاں بریلوی، ''تاریخ شعرائے روہیل کھنڈ''، ایضاً، ص ۲

۳۶۔ محمد نعیم اللہ خیالی، ''اردو الفاظ ایک بین الاقوامی رابطہ''، مصنّف خود بہرائچ (بھارت) ۱۹۸۸ء، ص ۲۷

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ محمد عبدالرسول، پروفیسر صاحبزادہ، ''تاریخِ تہذیبِ انسانی'' جلد اول، یونیورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۰۸ء، ص ۱۵۳

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۵۵

۴۰۔ محمد عابد حسین منہاس، ''تاریخ کہون''، چکوال ریسرچ سوسائٹی چکوال، ۲۰۰۲ء، ص ۳۶

۴۱۔ حنیف خلیل، ''اردو کی تشکیل میں پشتونوں کا کردار''، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۵۶

۴۲۔ خلیل صدیقی، ''زبان کیا ہے''، بیکن بکس ملتان، ۲۰۱۴ء، ص ۲۷۸

۴۳۔ محمد نعیم اللہ خیالی، ایضاً، ص ۲۸

۴۴۔ عین الحق فرید کوٹی، ''اردو زبان کی قدیم تاریخ''، ارسلان پبلی کیشنز، لاہور، جون ۱۹۷۲ء، ص ۹۶

۴۵۔ شایاں بریلوی، ایضاً، ص ۴

۴۶۔ ایک روایت کے مطابق حضرت آدمؑ ایک لاکھ زبانیں بولتے تھے، یہ بھی قابلِ غور ہے۔

☆ حضرت آدمؑ کا اتنی کثرت سے زبانیں جاننے سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ آپ کی نسل سے ہونے والی اقوام جہاں جہاں اور جو جو زبانیں قیامت تک بولنے والے تھے وہ تمام آپ کو سکھا دی گئیں۔

۴۷۔ محسن نقوی، سید، اردو زبان اور شمالی ہندوستان کی دوسری زبانوں کی ابتدائی تاریخ، مشمولہ، مجلّہ: القلم، شمارہ نمبر ۱۰، کراچی، ص ۹

۴۸۔ عطش درانی، پروفیسر ڈاکٹر، ''پاکستانی زبانوں کی تدریس''، نذیر سنز ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور، جون ۲۰۱۴ء، ص ۱۲
(عطش درانی کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی کتاب سے نقل تو کرتے ہیں لیکن کتاب کا حوالہ بہت کم دیتے ہیں۔)

۴۹۔ خلیل صدیقی، ایضاً، ص ۱۲۴

۵۰۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، لسانی جائزے، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۵ تا ۴۳

۵۱۔ رضا ہمدانی، قومی زبان کی ترقی میں سرحد کا حصہ، مشمولہ: ''پاکستان میں اردو''، تیسری جلد (اباسین) مرتبین: پروفیسر فتح محمد ملک و دیگر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۹۸

۵۲۔ عبدالمصطفیٰ محمد مجاہد العطاری، مولانا، ''انبیائے کرام اور ان کی قوموں کے احوال''، جلد اول، اکبر بک سیلرز، لاہور، ۲۰۱۳ء: ص ۳۳۶ (بحوالہ روح البیان، جلد اول، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ص ۱۳۶)

۵۳۔ القرآن، الرحمٰن: ۲۔۳

۵۴۔ القرآن، البقرہ: ۳۱ تا ۳۳

۵۵۔ القرآن، الحدید: ۲۵

۵۶۔ ولیم میک گاگی، ''انسانی تہذیب کے پانچ ادوار'' مترجم: حسن عابدی، مشعل بکس لاہور، س ن، ص ۴۷

۵۷۔ محمد عبدالرسول، صاحبزادہ، ایضاً، ص ۸۳

۵۸۔ جان جی جیکسن، ''انسان۔ خدا اور تہذیب'' مترجم: یاسر جواد، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۷۶، بحوالہ: (George A. Dorsey, The story of civilization, P-315)

59- Hall, H.R. "The Ancient History of the near East", Methueu & Co, London, 3rd Edition 1916.P -172,174

۶۰۔ نثار صفدر بلوٹی، ''قومی زبان اور دورِ حاضر''، اربابِ ادب پبلی کیشنز لاہور، س ن، ص ۴۱

۶۱۔ رماشنکر ترپاٹھی، ایضاً، ص ۳۹

۶۲۔ محمد عبدالرسول، پروفیسر صاحبزادہ، ایضاً، ص ۱۵۴

۶۳۔ مسکین حجازی، ''پنجاب میں اردو صحافت''، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۸

۶۴۔ محمود خان محمود، تاریخ جنوبی ہند، مطبع: برقی کوثر پریس بنگلور، ۱۹۴۰ء، ص ۱۹

۶۵۔ محمد نعیم اللہ خیالی، ایضاً، ص ۲۷

۶۶۔ عین الحق فرید کوٹی، ایضاً، ص ۱۰۳

۶۷۔ محمد نعیم اللہ خیالی، ایضاً، ص ۲۸

۶۸۔ ایضاً

۶۹۔ عین الحق فرید کوٹی، ایضاً، ص ۹۹

۷۰۔ ایضاً، ص ۹۷

۷۱۔ محمد نعیم اللہ خیالی، ایضاً، ص ۳۰

۷۲۔ نصیر حسین خان خیال، نواب، ''داستانِ اردو''، ادارہ اشاعتِ اردو، حیدر آباد دکن، س ن، ص ۱۰

۷۳۔ فصیح اللہ، سید، ''اردوئے فصیح''، مطبع نیشنل پریس الہ آباد، بار دوم، ۱۹۲۲ء، ص ۲

۷۴۔ محمد عبدالرسول، پروفیسر صاحبزادہ، ایضاً، ص ۹۳

☆ میرے خیال میں ڈھال، تلوار اور زرہ بکتر کا استعمال حضرت داؤد علیہ السّلام کے عہد میں ہوا اور آپ کا عہد دراوڑوں کے عہد سے بعد میں آتا ہے۔

۷۵۔ صرف چند مواقع ایسے آئے جب دانستہ فاتح قوموں نے مفتوحین کی تہذیب کو اپنا لیا یا باقی رہنے دیا گیا اور وہ قومیں طویل مدت تک اس خطے پر قابض رہیں۔

۷۶۔ محمد جمیل احمد بریلوی، 'اردو شاعری کی مختصر تاریخ''، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۴۰ء، ص ۹

۷۷۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ''اردو کا روپ''، مجلسِ علومِ آلِ عبا، سرگودھا، ۱۹۷۱ء، ص ۸۰

۷۸۔ چونکہ لسانیات، میرا موضوع نہیں اس لیے اس پر بحث میرے لیے ممکن نہیں نیز یہ طوالت کا

باعث بنے گی۔

۷۹۔ مسعود حسین خان، پروفیسر، ''تاریخِ زبان اردو''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، س ن، ص ۶

۸۰۔ وارث سرہندی، ''زبان و بیان''، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۹۶

۸۱۔ کلامِ مقدس، ۲۔ اخبار، ۸: ۱۸، ابلاغیاتِ مقدس پولوس، بار ہشتم، ۱۹۹۹، ص ۵۲۶

۸۲۔ محمود خان محمود، : ص ۲۱

۸۳۔ سموئل جے شلٹز، : ص ۲۲۷

۸۴۔ آریاؤں کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں جیسے جرمنی، ہنگری، آسٹریا، روس ترکستان، پامیر، سکینڈے نیویا، قرغیز کے صحرا تبت وغیرہ سے حملہ آور ہوئے۔

۸۵۔ لیاقت علی سندھو، ''کھوج''، ظہ پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱

۸۶۔ شوکت علی فہمی، مفتی، ''ہندوستان پر اسلامی حکومت''، دین دنیا پبلی کیشنز جامع مسجد دہلی، جدید ایڈیشن ۱۹۵۷ء، ص ۳۶

۸۷۔ اختر اورینوی، ''بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء''، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۲۳

۸۸۔ شایاں بریلوی، ایضاً ص ۸

۸۹۔ محمد عابد حسین منہاس، ایضاً ص ۳۶

۹۰۔ مسعود حسین خان، پروفیسر، ''تاریخ زبان اردو، ایضاً ص ۱۰

۹۱۔ محمد مجیب، ''تاریخ تمدنِ ہند''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، اول ۱۹۷۲ء، سوم ۱۹۹۹ء، ص ۵۳

۹۲۔ محمد عبدالرسول، پروفیسر صاحبزادہ، ایضاً ص ۱۶۶، ۱۶۷

۹۳۔ دیانند سرسوتی، سوامی، ''رگ وید۔ ایک مطالعہ''، مترجم: نہال سنگھ، نگارشات لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۔۱۱

۹۴۔ نصیر الدین ہاشمی، ''دکن میں اردو''، اردو مرکز، لاہور، چوتھی بار پاکستان ۱۹۵۲ء، ص ۱۰

۹۵۔ وہاب اشرفی، پروفیسر، ''تاریخِ ادبیات عالم''، جلد دوم، پورب اکادمی اسلام آباد، جون ۲۰۰۶ء، ص ۲۳۰

۹۶۔ باشم، اے ایل، ''ہندوستانی تہذیب کی داستان''، مترجم، ایس غلام سمنانی، نگارشات، لاہور،

۱۹۹۹ء،ص ۶۸
۹۷۔ امولیہ رنجن مہاپتر،''فلسفۂ مذاہب''،مترجم: یاسر جواد، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۳۱
۹۸۔ کیرن آرمسٹرانگ، ''تہذیبوں کی کایا کلپ''، مترجم، پروفیسر حنیف کھوکھر، مشعل بکس، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۸
۹۹۔ احمد دہلوی، مولوی سید، ''فرہنگ آصفیہ''، جلد اول، مطبع رفاہِ عام پریس لاہور، ۱۹۰۸ء، ص ۲۔۳
۱۰۰۔ سبطِ حسن، ''پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء''، مکتبہ دانیال کراچی، آٹھویں بار، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۲ (بحوالہ پروفیسر بدھ پرکاش)
۱۰۱۔ مسکین حجازی، ایضاً، ص ۸۰
۱۰۲۔ عبدالوحید، ''۱۰۰۱ء شخصیاتِ عالم کا انسائیکلوپیڈیا''، نگارشات پبلشرز، لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۳۹۹
۱۰۳۔ احمد دہلوی، سید، ایضاً، ص ۳
۱۰۴۔ راقم نے ۱۹۸۶ء میں پہلی بار ان مقامات کا سفر کیا اور اس تحریر کا انگریزی ترجمہ Peshawar Past and Present پڑھا۔ دوبارہ ان مقامات کو دیکھنے کا اتفاق ۲۰۰۶ء میں ہوا۔
۱۰۵۔ حمید اُلفت ملغانی، ''پاکستانی زبانوں کا ادب''، بیکن بکس ملتان، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۰
۱۰۶۔ محمد نعیم اللہ خیالی، ایضاً، ص ۳۸
۱۰۷۔ عابد حسین، سید، ''قومی تہذیب کا مسئلہ''، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، ص ۴۶
۱۰۸۔ کشن پرشاد کول، ''ادبی اور قومی تذکرے''، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۵۱ء، ص ۴
۱۰۹۔ رفیق مارہروی، سید، ''ہندوؤں میں اردو''، نسیم بک ڈپو لکھنو، ۱۹۵۷ء، ص ۲۹
۱۱۰۔ شیو پرشاد، بابو، ''جامِ جہان نما''، جلد دوم، مطبع نول کشور لکھنو، بار دوم ۱۸۶۰ء، ص ۵
۱۱۱۔ مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ''اردو زبان کا تدریسی ارتقاء''، مشمولہ: ماہنامہ اخبارِ اُردو، اسلام آباد، جلد ۸، شمارہ ۵، مئی ۱۹۹۱ء، ص ۱۲
۱۱۲۔ شوکت علی فہمی، مفتی، ہندوستان پر اسلامی حکومت، ایضاً، ص ۴۹
۱۱۳۔ محمد مجیب، ''تاریخِ تمدن ہند''، ایضاً، ص ۱۵۶
۱۱۴۔ علی عباس جلالپوری، ''روایات تمدن قدیم''، نگارشات لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۱۸۰
115- Smith , E.J,The Cambridge History of India ,vol 1, Delhi, 1962,

pp,512-514

۱۱۶۔ رفیق مارہروی، سید، ایضاً، ص ۳۴

۱۱۷۔ ہاشم، اے۔ایل، ایضاً، ص ۱۰۴

۱۱۸۔ حمید اُلفت ملغانی، ''پاکستانی زبانوں کا ادب''، ایضاً، ص ۲۸، ۳۰

۱۱۹۔ ''جامع اردو انسائیکلوپیڈیا''، جلد ۲، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۴۳۸

۱۲۰۔ ''اُردو انسائیکلوپیڈیا''، جلد اول، قومی کونسل برائے ترقی اردو، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۵۴۴

۱۲۱۔ خلیل صدیقی، ''زبان کا مطالعہ''، مستونگ قلات، ۱۹۶۴ء، ص ۴۲

۱۲۲۔ بادشاہ منیر بخاری، ''اُردو اور کھوار کے لسانی روابط''، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد ۲۰۰۳ء، ص ۱۸

۱۲۳۔ یوسف متالا، مولانا، مشائخ احمد آباد، مکتبہ الحرمین لاہور، دوم ۲۰۱۱ء، ص ۷

۱۲۴۔ انور رومان، پروفیسر ایم، ''بلوچستان میں اردو۔ پس منظر اور پیش منظر''، مشمولہ: ''پاکستان میں اردو''، دوسری جلد، بلوچستان، مرتبین، پروفیسر فتح محمد ملک ودیگر، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۸۷

۱۲۵۔ فصیح اللہ، سید، ایضاً، ۱۵

۱۲۶۔ کالا سنگھ بیدی، ''تین ہندوستانی زبانیں''، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۶

۱۲۷۔ کرم الٰہی ڈونگوی، صوفی، ''تذکرہ بہادرانِ اسلام''، حصہ دوم، تاجران کتب اسلامیہ لاہور، ۱۹۱۰ء، ص ۱۱

۱۲۸۔ انور رومان، پروفیسر ایم، ایضاً، ص ۸۷

۱۲۹۔ محمد اطہر مبارکپوری، مولانا قاضی، ''خلافتِ راشدہ اور ہندوستان''، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۷۲ء، ص ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵

۱۳۰۔ محمد اطہر مبارک پوری، مولانا قاضی، رجال السندھ والہند، ترجمہ مولانا عبدالرشید بستوی، سندھ وہند کی قدیم شخصیات، مکتبہ خدیجۃ الکبریٰ، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۷۶

۱۳۱۔ یوسف متالا، مولانا، ایضاً، ص ۷

۱۳۲۔ رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر، ''اردو نثر کا آغاز اور ارتقا''، مجلس تحقیقات اردو حیدر آباد، (اے پی) س ن، ص ۲

۱۳۳۔ سلیمان ندوی، سید، ''نقوش سلیمانی''، مطبع کلیم پریس کراچی، ۱۹۵۱ء، ص ۳۱

۱۳۴۔ رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر، ایضاً، ص ۳

۱۳۵۔ کالا سنگھ بیدی، ایضاً، ص ۱۱۲

۱۳۶۔ یوسف متالا، مولانا، ایضاً، ص ۹، ۱۰

۱۳۷۔ ضامن علی ایم اے، مولوی سید، ''اردو زبان و ادب'' کے متر اانڈین پریس الٰہ آباد، ۱۹۲۷ء، ص ۲

☆ قبل ازیں یہ بحث تاریخ کے تسلسل میں تاریخ کے حوالے سے ہو چکی ہے جس میں شاید عصری اختلاف بھی موجود ہے۔

۱۳۸۔ شیما مجید (مرتب) ''لسانی مذاکرات (۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۸ء)''، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۵۶

۱۳۹۔ نصیر الدین ہاشمی، ''دکن میں اردو''، ایضاً، ص ۱۰

۱۴۰۔ وقار عظیم، ''ہندوستان کے مسلمان حکمران''، مشمولہ: روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۶ء، ص ۵

۱۴۱۔ نسیم، ڈاکٹر الف۔ د، اردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۱۹

☆ راجہ نندی کا نام صاحب تاریخِ مرکز ہند نے راجہ گنڈا تحریر کیا ہے۔

۱۴۲۔ محمد انصار اللہ، ''تاریخ ارتقاءِ زبان و ادب'' (پہلا حصہ) مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۲

۱۴۳۔ ایضاً، محمود پور اُن دنوں لاہور کا نام رکھا گیا تھا۔

۱۴۴۔ اے حمید، ''اردو شعر کی داستان'' (ا) مطبوعات شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن، ص ۱۹

۱۴۵۔ عین الحق فرید کوٹی، مغل شہنشاہوں کی ہندوی شاعری، مشمولہ، ماہنامہ، ماہِ نو، لاہور، جلد ۳۳، شمارہ ۲: فروری ۱۹۸۰ء، ص ۱۴

۱۴۶۔ محمود شیرانی، حافظ، مقالاتِ شیرانی، جلد اول، مرتب: مظہر محمود شیرانی مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۸۵

۱۴۷۔ عین الحق فرید کوٹی، مغل شہنشاہوں کی ہندوی شاعری، ایضاً، ص ۱۴

۱۴۸۔ تاریخِ مرکز ہند، ص ۱۰۰ (جو ایک نسخہ میرے مطالعے میں آیا وہ بہت پرانا ہے جس کے ابتدائی صفحات پھٹے ہوئے ہیں)

۱۴۹۔ حمید یزدانی، ڈاکٹر خواجہ، اقبال اور مسعود سعد سلیمان، مشمولہ: سہ ماہی اقبالیات، (اردو) لاہور، جلد ۲۶، شمارہ ۴، جنوری تا مارچ، ۱۹۸۶، ص ۲۰

۱۵۰۔ محمد انصار اللہ، ''تاریخ ارتقاءِ زبان وادب''، ایضاً ص ۳۷، ص ۳۸ (بحوالہ ''لباب الالباب''، ص ۲۴۶)

۱۵۱۔ محمود شیرانی، ''پنجاب میں اردو''، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، دوم: ۱۹۹۰ء، ص ۳۹

۱۵۲۔ رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر، ایضاً، ص ۱۳ (بحوالہ: ہسٹری آف پرشین لینگویج اینڈ لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ، ص ۱۸)

۱۵۳۔ کارل مارکس، ''ہندوستان کا تاریخی خاکہ''، ترتیب وتعارف: احمد سلیم تخلیقات لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۹

۱۵۴۔ ضامن علی ایم اے، مولوی سید، ''اردو زبان وادب''، ایضاً، ص ۴

۱۵۵۔ مظفرؔ حسن ملک، اردو زبان کا تدریجی ارتقا، ایضاً، ص ۱۲

۱۵۶۔ ہاشمی فرید آبادی، سید، اردو کی حقیقت تاریخ سے، مشمولہ، سہ ماہی، اردو کراچی، جلد ۳۲، شمارہ: ۱۔۲، جنوری واپریل ۱۹۵۳ء، ص ۸

۱۵۷۔ اے حمید، اردو نثر کی داستان (ا) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س ن، ص ۱۷

۱۵۸۔ تاریخِ مرکز ہند، ص ۲۲۰

۱۵۹۔ خورشید احمد فاروق (مترجم) ''تاریخِ ہند پر ایک نئی روشنی''، ندوۃ المصنّفین، س ن، ص ۱۴۔۱۵

۱۶۰۔ محمد انصار اللہ، ایضاً، ص ۳۲۰

۱۶۱۔ عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی، ''منتخب التواریخ''، مترجم: محمد احمد فاروقی، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ لاہور، س ن، ص ۲۱۵

۱۶۲۔ تاریخِ مرکز ہند، ص ۳۶۳

۱۶۳۔ ''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند''، تیسری جلد، فارسی ادب (اول) پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۲۳

۱۶۴۔ ایضاً،ص ۲۵

۱۶۵۔ عنایت اللہ، ڈاکٹر شیخ، ''اردو زبان کا ترکی عنصر''، مشمولہ: سہ ماہی صحیفہ، لاہور، شمارہ نمبر ۶۲، جنوری ۱۹۷۳ء، ص ۱۸

۱۶۶۔ ہاشمی فرید آبادی، سید، ''اردو کی حقیقت تاریخ سے''، ایضاً، ص ۱۲ (بحوالہ تاریخ داؤد شاہی (قلمی) ورق ۶۶

۱۶۷۔ نصیر حسین خان خیال، ادیب الملک نواب، ''داستانِ اردو''، ایضاً، ص ۴۷

۱۶۸۔ ایضاً، ص ۴۸

۱۶۹۔ انصار الدین ابراہیم، ''ظہیر الدین بابر کی تصانیف میں اردو الفاظ''، مشمولہ: ماہنامہ، اخبارِ اردو، اسلام آباد، جلد ۱۸، شمارہ ۹، ستمبر ۲۰۰۲ء، ص ۳

۱۷۰۔ جمیل یوسف، بابر سے ظفر تک، کتاب گھر اسلام آباد، سوم، ۱۹۸۹ء، ص ۱۶

۱۷۱۔ خاطر غزنوی، ''سرحد میں اردو شاعری کا ارتقاء''، مشمولہ: ''پاکستان میں اردو''، جلد ۳ (اباسین) ایضاً، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۲

۱۷۲۔ تاریخِ مرکزِ ہند، ایضاً، ص ۴۳۰

۱۷۳۔ جلال الدین محمد اکبر شب یک شنبہ ۵ رجب ۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء کو امر کوٹ (عمر کوٹ) کے مقام پر پیدا ہوا۔ یہ مقام آج بھی عمر کوٹ سے تقریباً دو یا تین کلومیٹر کے فاصلے پر جنگل میں ہے۔ راقم کو وہاں جانے اور اس مقام کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس مقام پر ایک بورڈ نصب ہے۔ جس پر اکبر کے مختصر حالات زندگی لکھے ہوئے ہیں۔ ایک چبوترا کبھی بنایا گیا ہوگا جو زمین بوس ہو چکا ہے۔ شاید چند سالوں بعد یہ بورڈ بھی کوئی اکھاڑ کر لے جائے یا مرورِ زمانہ سے مٹ جائے اور وہ ''بتی'' جس پر جائے پیدائش اکبر لکھا ہوا ہے وہ بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے کیونکہ اس کے نزدیک کوئی آبادی نہیں۔ اکبر نے ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ/ ۱۵۵۵ء کو سلطنت پر جلوس کیا۔ اور ۱۳ جمادی الثانی / ۱۶ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو وفات پائی۔

۱۷۴۔ فصیح اللہ، فصیح الملک سید، ''اردوئے فصیح''، ایضاً، ص ۳۲

۱۷۵۔ عین الحق فرید کوٹی، ''مغل شہنشاہوں کی ہندوی شاعری''، ایضاً، ص ۱۷

۱۷۶۔ نصیر حسین خان خیال، ادیب الملک نواب سید، ''مغل اور اردو''، ادارہ اشاعتِ اردو، حیدر آباد

(دکن) ۱۹۳۳ء، ص ۸

۱۷۷۔ ابو القاسم سرور، سید، سوجھ بوجھ کے ڈھائی اچھر، ماہنامہ، ساقی، دہلی جلد ۲۰، شمارہ ۳، ستمبر ۱۹۳۹ء، ص ۱۲

۱۷۸۔ ایضاً، ص ۴

۱۷۹۔ عبدالحئی، مولانا حکیم سید، ''تذکرہ شعرائے اردو موسوم بہ گلِ رعنا''، مطبع معارف اعظم گڑھ، دوم ۱۳۵۴، ص ۹

۱۸۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ''تاریخ ادب اردو''، جلد اول، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، سوم: دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۵۶، ۵۷

۱۸۱۔ ایضاً، ص ۵۸

۱۸۲۔ ایضاً، ص ۵۸

۱۸۳۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۸۴۔ ایضاً

۱۸۵۔ ایضاً، ص ۶۰

۱۸۶۔ نصیر حسین خان خیالؔ، ادیب الملک نواب سید، ''مغل اور اردو''، ایضاً، ص ۱۴

۱۸۷۔ انوار ہاشمی، تاریخ پاک و ہند، کراچی بک سینٹر، کراچی، س ن، ص ۲۷۸

۱۸۸۔ ایضاً، ص ۲۸۰

۱۸۹۔ نصیر حسین خان خیالؔ، ادیب الملک نواب سید، ''مغل اور اردو''، ایضاً، ص ۱۶

۱۹۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب میں سفر نامہ''، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۹۷

۱۹۱۔ بینی پرشاد، ''تاریخِ جہانگیر''، مترجم: رحم علی الہاشمی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، چہارم ۲۰۱۰ء، ص ۳۴۱

۱۹۲۔ ایضاً، ص ۳۴۲، راجہ مان سنگھ اکبر اور پھر جہانگیر کی فوج کا جرنیل رہا نیز وہ جہانگیر کی پہلی بیوی مان بائی کا بھائی بھی تھا۔ اپنے بھانجے خسرو کی بغاوت میں اس نے ہی کردار ادا کیا تھا اور فوجی دستوں کی کمان کی تھی۔ وہ ایک صاحبِ طرز ادیب بھی تھا۔

۱۹۳۔ فصیح اللہ، فصیح الملک سید، ایضاً، ص ۳۶

۱۹۴۔ مظہر محمود شیرانی، مرتب: ''مقالات حافظ محمود شیرانی''، جلد اول، لاہور، ص ۱۵
۱۹۵۔ احمد خان، سرسید، آثار الصنادید، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۲۰۵
۱۹۶۔ عبدالغفور خان بہادر نساخ، مولوی، ''زبان ریختہ''، منشی نول کشور لکھنؤ، ۱۸۷۴ء، ص ۴
۱۹۷۔ محمد حسین آزاد، حضرت شمس العلماء مولانا مولوی، آبِ حیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، س ن، ص ۲۱
۱۹۸۔ میر امن دہلوی، ''باغ و بہار قصہ چہار درویش''، رحمٰن برادرس تاجران کتب کراچی، س ن، ص ۴
۱۹۹۔ انشاء اللہ خان انشاء، سید، ''دریائے لطافت''، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، دوم ۱۹۸۸ء، ص ۷۰
۲۰۰۔ غالب، مرزا اسد اللہ خان، ''عودِ ہندی''، مرتبہ: سید مرتضیٰ حسین فاضل، مجلس ترقی ادب لاہور، جون ۱۹۶۷ء، ص ۲۴۱
201- Grahame Bailey, A History of Urdu Litrature, Al-Biruni, Lahore 1977, p-10
۲۰۲۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر ''جامع القواعد''، مرکزی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۲۷
۲۰۳۔ فارغ بخاری، پہلی بات، مشمولہ: ''خوشحال خان خٹک'' از فارغ: بخاری و رضا ہمدانی، لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد، دوم ۱۹۸۷ء، ص ۱۰
۲۰۴۔ فارغ بخاری و رضا ہمدانی، ''خوشحال خان خٹک''، ایضاً ص ۱۰۰
۲۰۵۔ ایضاً ص ۱۱۴
۲۰۶۔ فارغ بخاری، ''سرحد میں اردو''، مشمولہ: ''پاکستان میں اردو''، تیسری جلد (اباسین)، ۲۰۰۶ء، ص ۳
۲۰۷۔ شاہدہ بیگم، ڈاکٹر، ''سندھ میں اردو''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۸۰ء، ص ۸۵
۲۰۸۔ محمد صالح کنبوہ، ''شاہجہان نامہ''، جلد دوم و سوم، ترجمہ: ڈاکٹر ناظر حسین زیدی، مرکزی اردو بورڈ لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۱۷۷
۲۰۹۔ دارا شکوہ، شہزادہ، ''سکینۃ الاولیاء''، ترجمہ: پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی، پیکجز لمیٹڈ لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۶۱
۲۱۰۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ''ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ''، مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۰
۲۱۱۔ عبدالقدوس ہاشمی، ''تقویم تاریخی''، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، دوم ۱۹۸۷ء، ص ۲۵۷،

ص ۲۸۰

۲۱۲۔ محمد سعید احمد مارہروی، ''آثارِ خیر''، مطبع عزیزی آگرہ، ۱۳۳۳ھ، ص ۴۷

۲۱۳۔ ایضاً، ص ۴۸

۲۱۴۔ عنایت الرحمٰن صدیقی، بریگیڈیٹر (ر)، ''اربابِ سیف وقلم''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۳۴۲، ۳۴۳

☆ یہ کتاب میرے خیال میں ۱۹۹۷ء میں شائع نہیں ہوئی۔ راقم بریگیڈ ئیر صاحب کو نومبر ۱۹۹۷ء میں جب ملا تو یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی تھی۔ راقم کی کتاب ''اردو ادب اور عساکرِ پاکستان'' جلد اول اور جلد دوم ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی تھیں۔ اربابِ سیف وقلم، کے صفحہ ۲۹۳ پر راقم کا تعارف اس بات کا غماز ہے کہ یہ کتاب کہیں ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی ہوگئی۔

۲۱۵۔ اے حمید، ''اردو نثر کی داستان''، (ا) ایضاً، ص ۲۷

اے حمید مزید لکھتے ہیں کہ قصائد عرض کی شرح مفتاح النکات کے مصنف نے بھی اس کتاب کا ذکر کیا ہے اور اس کے مصنف کا نام معز الدین جہاندار بتایا ہے۔ اس کتاب میں ایک دیباچہ اور سات ابواب ہیں۔ اے حمید نے اس کی مزید تفصیل بھی دی ہے۔

۲۱۶۔ زیب النساء میرے موضوع کا حصہ نہیں لیکن اس کی شستہ، صاف اور سلیس اردو دیکھ کر اس کے تین شعر مذکورہ عہد میں اردو کی ارتقائی منازل کو اجاگر کرنے کے لیے پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ اشعار تذکرہ جلوۂ خضر میں موجود ہیں۔

خدا کسی کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے　　جدا ہو مجھ سے مرا یار یہ خدا نہ کرے

پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی　　کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی

خوابِ عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے　　آ کر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے

۲۱۷۔ نظامی بدایوانی، ''قاموس المشاہیر''، جلد دوم، خدابخش پبلک اورینٹل لائبریری، پٹنہ، (اول ۱۹۲۶ء) ثانی ۲۰۰۴ء، ص ۸۸ (لیکن یہ تاریخ پیدائش تقویمِ تاریخی سے میل نہیں کھاتی)۔

۲۱۸۔ محمود شیرانی، ''پنجاب میں اردو''، ایضاً، ص ۱۱۸

۲۱۹۔ محمد انصاراللہ، پروفیسر، ''جامع التذکرہ''، جلد اول، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۴۷

۲۲۰۔ محمد قاسم فرشتہ، ''تاریخ فرشتہ''، جلد اول، ترجمہ، عبدالحیٔ خواجہ (مشفق خواجہ)، المیزان ناشران، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۰۴

☆ یہ لفظ ممکن ہے ایلورہ ہو جس کی ایک تاریخی اہمیت ہے اور یلورہ نامی کوئی شہر نقشے پر موجود نہیں۔

۲۲۱۔ ''اردو انسائیکلو پیڈیا''، جلد اول، ایضاً، ص ۴۶

۲۲۲۔ بہمنی حکومت کا قیام، ۳۱/اگست ۱۳۴۷ء کو عمل میں آیا۔

۲۲۳۔ نصیر الدین ہاشمی، ''دکن میں اردو''، ایضاً، ص ۲۴

۲۲۴۔ وہ پانچ بھائی ہری ہر، کمپا، بکا، مارپا اور مودپا تھے۔

۲۲۵۔ شاستری، پروفیسر کے۔ اے نیلکنٹھ، ''وجے نگر کے عہد میں نظامِ حکومت اور سماجی زندگی''، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان حکومتِ ہند، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶

۲۲۶۔ بیجاپور میں عادل شاہی دور (۱۴۹۰ء سے ۱۶۸۵ء)، گولکنڈہ میں قطب شاہی دور (۱۵۱۸ء سے ۱۶۸۶ء)، برار میں عماد شاہی دور (۱۴۸۴ء سے ۱۵۷۴ء)، احمد نگر میں نظام شاہی حکومت (۱۴۹۸ء سے ۱۶۰۰ء) اور بیدر میں برید شاہی دور (۱۵۲۷ء۔ ۱۶۰۹ء) رہا۔

۲۲۷۔ اس کا عملی تجربہ ہم نے جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں دیکھا کہ اس نے جب پہلی بار اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں تلاوتِ قرآن مجید کے ساتھ اردو میں تقریر کی تو وطنِ عزیز میں بھی اردو بولنے کا رجحان پیدا ہوا۔ اس نے قومی لباس کو اپنایا تو وزراء اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ یہاں تک کہ نوجوان بھی شلوار قمیض پہننا فخر محسوس کرتے تھے۔

۲۲۸۔ ہاشمی فرید آبادی، سید، ''اردو کی حقیقت تاریخ سے''، ایضاً، ص ۱۳

۲۲۹۔ احتشام حسین، سید، ''اردو کی کہانی''، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، پانچویں بار، ۲۰۱۱ء، ص ۲۹

۲۳۰۔ محمد نعیم اللہ خیالی، ''اردو الفاظ ایک بین الاقوامی رابطہ''، ایضاً، ص ۴۱

۲۳۱۔ محمد یوسف الدین، خواجہ، ''تذکرہ یورپین اور انڈو یورپین شعرائے اردو''، مطبع ابراہیمہ حیدرآباد، دکن، ۱۹۵۹ء، ص ۳۵

232- Ram Babu Saksena, European and Indo -European poets of urdu and persian, Book Traders, Lahore, p 8

233- Ibid, p-9

۲۳۴۔صفیر بلگرامی،سید فرزند احمد،"تذکرہ جلوہ خضر"(جلد اول و دوم)مطبع نورالانوار لکھنؤ،۱۸۸۵ء،ص۲

۲۳۵۔غلام رسول مہر،مولانا،"۱۸۵۷ء"،کتاب منزل لاہور،س ن،ص ۲۱

236- Mojumdar, R.C. An Advanced History of India ,vol 8,Aziz publisher, Lahore, 1980,p-632

۲۳۷۔صفیر بلگرامی،سید فرزند احمد،ایضاً،ص۴۱

۲۳۸۔محمد نعیم اللہ خیالی،ایضاً،ص۴۱

۲۳۹۔ضامن علی،مولوی سید،ایضاً،ص ۷

۲۴۰۔ مورلینڈ،ڈبلو۔ایچ،"اکبر سے اورنگ زیب تک"،مترجم: جمال محمد صدیقی،قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان حکومت ہند،نئی دہلی،چوتھی بار،۲۰۱۰ء،ص۲۳

۲۴۱۔ محمد نعیم اللہ خیالی،ایضاً،ص۴۳

۲۴۲۔ عطش درانی،"اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم"،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور ۱۹۸۷ء،ص۱۲

۲۴۳۔مبارک علی،ڈاکٹر،"تاریخ اور تحقیق"،فکشن ہاؤس لاہور،دوسرا ایڈیشن،۲۰۰۵ء،ص ۸۹

۲۴۴۔محمد نعیم اللہ خیالی،ایضاً،ص۴۳

☆ رام بابو سکسینہ اور دیگر کئی مورخین نے یہ نام ہوپکنس کی بجائے ہوکنس لکھا ہے۔

۲۴۵۔ عطش درانی،"اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم"،ایضاً،ص۱۳

۲۴۶۔ محمد نعیم اللہ خیالی،ایضاً،ص۴۳

۲۴۷۔ مسعود حسن رضوی ادیب،سید،"اردو زبان اور اس کا رسم الخط"،دانش محل لکھنؤ،۱۹۴۸ء،ص ۷

۲۴۸۔ عبدالمجید سندھی،ڈاکٹر میمن،"نگارشاتِ سندھ"،سندھی ادبی اکیڈمی لاڑکانہ (سندھ) ۱۹۹۲ء، ص۱۵۳

۲۴۹۔ نکولاؤ منوچی،"داستانِ مغلیہ"(اسٹوریا دی موگور کا ترجمہ)مترجم: سجاد باقر رضوی،نگارشات لاہور،۱۹۶۸ء،ص۶

۲۵۰۔ سلیم الدین قریشی،"اٹھارویں صدی کی اردو مطبوعات"(توضیحی فہرست)مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد،۱۹۹۳ء،ص۱۱

۲۵۱۔ ایضاً،ص۱۳

۲۵۲۔ سکندر خان بلوچ،''تاریخ کے زخم''، الفیصل ناشران لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۳۸۸
۲۵۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر،''برطانوی راج، ایک تجزیہ''، فکشن ہاؤس لاہور، باردوم، ۲۰۰۵ء، ص ۲۳
۲۵۴۔ بابو شیو پرشاد،''جامِ جہاں نما'' (جلد دوم)، ایضاً، ص ۱۴
۲۵۵۔ احتشام حسین، سید،''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ''، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ص ۸۴
۲۵۶۔ ماہنامہ زینت، لاہور، شخصیات نمبر، جلد ۲، شمارہ ۱۱، مئی ۱۹۹۱ء، ص ۲۰۶ء
۲۵۷۔ محمد جواد رضوی، سید،''ریاست حیدر آباد میں جدو جہد آزادی'' (ابتدائی دور)، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۴۷
۲۵۸۔ باری علیگ، کمپنی کی حکومت، نیا ادارہ لاہور، چہارم: ۱۹۶۹ء، ص ۱۷۴
۲۵۹۔ ایضاً
۲۶۰۔ محمد واضح رشید حسنی ندوی، مولانا سید،''سلطان ٹیپو شہید''، مجلسِ تحقیقات و نشریاتِ اسلام، لکھنؤ، باردوم، ۲۰۱۱ء، ص ۵۹۔۶۰
☆ ٹیپو سلطان جیسی شخصیت اور اس کی علمی وادبی خدمات پر بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن آپ کا اردو کلام یا تحریر نہ ملنے کے باعث آپ کے مختصر تعارف کو روایت میں شامل کرنا پڑا۔
۲۶۱۔ عبدالوحید،''۱۰۰ شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا''، ایضاً، ص ۵۰۴
۲۶۲۔ عبدالمقیت،''ٹیپو سلطان۔ دی گریٹ''، مشمولہ: سہ ماہی دیدہ ور، باسٹن (امریکہ) جولائی تا ستمبر ۲۰۱۱ء، شمارہ: ۱۳، ص ۱۶۴
227- Abdul kalam, A.P.J, Wings of Fire, University Press (India) Private Limited, 1999, P-25
۲۶۴۔''اردو انسائیکلوپیڈیا''، جلد اول، ایضاً، ص ۵۶
۲۶۵۔ محمد حمید اللہ،''اردو کا رواج ٹیپو سلطان کی فوج میں''، مشمولہ مجلّہ عثمانیہ، حیدر آباد (دکن) جلد ۲، شمارہ: ۱، ص ۵۹، ۶۱
۲۶۶۔ لیفٹیننٹ اور میجر دو الگ رینک ہیں۔ میرے مطالعے میں بریگیڈیئر جنرل، میجر جنرل اور لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے تو آئے ہیں لیکن لیفٹیننٹ میجر کا رینک میرے علم میں نہیں ہے ممکن ہے میجر اولینڈ سن نام ہو اور لیفٹیننٹ عہدہ ہو جیسے ہمارے شہید، نشانِ حیدر کیپٹن، کرنل شیر خان

جن کا نام کرنل شیر خان اور رینک کیپٹن ہے۔امریکہ کے ایک ادیب میجر جان (۱۴۶۹ء۔ ۱۵۵۰) یا برطانیہ کے ایک وزیر اعظم بھی جان میجر (ولادت: ۱۹۴۳ء) رہے ہیں۔

۲۶۷۔محمد عتیق صدیقی، ''گل کرسٹ اور اس کا عہد''، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۶۰ء، ص ۳۸

۲۶۸۔ایضاً، ص ۱۸۹

۲۶۹۔ ظہیرالدین مدنی، سید، ''سخن ورانِ گجرات''، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۹۳

۲۷۰۔ سری رام ایم۔اے، لالہ تذکرہ ہزارداستان، معروف بہ خم خانۂ جاوید، جلد سوم، مطبع دلی پرنٹنگ ورکس دہلی، ۱۹۱۷ء، ص ۸

۲۷۱۔ میر حسن دہلوی، تذکرہ شعرائے اردو، مرتبہ: مولانا محمد حبیب الرحمان شیروانی، مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ، ۱۹۳۲ء، ص ۶۵

۲۷۲۔ صابر دہلوی، مرزا قادر بخش، ''تذکرہ گلستانِ سخن''، جلد اول، مرتبہ: خلیل الرحمان داؤدی، مجلسِ ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۳۷۶

۲۷۳۔محمد مصطفیٰ خان شیفتہ، نواب، ''گلشنِ بے خار''، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی، ۱۹۶۲ء، ص ۲۸۴

۲۷۴۔ کلب علی خان فائق، مرتبہ، ''کلیاتِ میر'' (دیوانِ اول۔جلد اول) مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۶۶

۲۷۵۔میر تقی میر، ''میر کی آپ بیتی''، مترجم: نثار احمد فاروقی، بک کارنر جہلم، ۲۰۱۶ء، ص ۹۸

۲۷۶۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۲۷۷۔ایضاً، ص ۱۰۳

۲۷۸۔ثناء الحق ایم اے، ''میر وسودا کا دور''، ادارہ تحقیق وتصنیف کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۳۰۹

۲۷۹۔سری رام، لالہ، ''خم خانۂ جاوید''، جلد سوم، ایضاً، ص ۸۳

۲۸۰۔عبدالرشید عصیم، ''تذکرہ تلامذۂ شاہ حاتم دہلوی''، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۹۴ء، ص ۵۹

۲۸۱۔شاغل عثمانی، احترام الدین احمد، ''تذکرہ شعرائے جے پور''، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۸ء، ص ۲۲۲، ۲۲۳

۲۸۲۔ مجلّہ ''اُردو معلّیٰ''، دہلی یونیورسٹی، میر سوز نمبر، جلد ۴، شمارہ ۶۔۷، ۱۹۶۳ء، ص ۳۹

۲۸۳۔سعادت خان ناصر، ''تذکرہ خوش معرکہ زیبا''، مرتبہ، مشفق خواجہ، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۶۱

۲۸۴۔سری رام، ''لالہ، خمخانۂ جاوید''، جلد سوم، ایضاً، ص ۱۴۷

۲۸۵۔ماہنامہ شام وسحر، نعت نمبر ا، لاہور، جلد نمبر ۷، شمارہ نمبر ا۔۲، جنوری فروری ۱۹۸۱ء

۲۸۶۔جوہر دیوبندی، ''موجِ گنگ'' (تذکرہ شعرائے ہنود) مصنف خود، دیوبند، ۱۹۸۳ء، ص ۲۳۰

۲۸۷۔امداد صابری، ''۱۸۵۷ء کے غدار شعراء''، مطبع یونین پریس دہلی، ۱۹۶۰ء، ص ۴۸

۲۸۸۔عاکف سنبھلی، ڈاکٹر رضاء الرحمان، ''سوانحی انسائیکلو پیڈیا''، جلد دوم، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۲۲۱

۲۸۹۔ سری رام، لالہ، ''خم خانۂ جاوید'' جلد سوم، ایضاً، ص ۳۴۳

۲۹۰۔ نورالحسن ہاشمی، ''دہلی کا دبستانِ شاعری''، بک ٹاک لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۲۲۶

۲۹۱۔ شاغل عثمانی، احترام الدین احمد، ایضاً، ص ۴۵۱

۲۹۲۔ ایضاً، ص ۳۳۷

۲۹۳۔ایضاً، ص ۱۸۴، ۱۹۰

۲۹۴۔سہ ماہی اردو، کراچی، جلد نمبر ۸۴، شمارہ ا تا ۴، جنوری تا دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۳۱

۲۹۵۔ تسکین عابدی، سید، سخن ورانِ دکن، مطبع برقی پریس حیدر آباد، دکن ۱۹۳۸ء، ص ۱۷۷

۲۹۶۔ ایضاً، ص ۱۷۷

۲۹۷۔آفاق احمد، پروفیسر، ''مدھیہ پردیش میں اردو زبان وادب''، مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال، ۱۹۹۶ء، ص ۱۸۱

۲۹۸۔ صدیق مجاہد، ''کرن کرن غنیمت''، بزمِ غنیمت پبلی کیشنز گنجاہ (گجرات) ۲۰۰۰ء، ص ۹۱

۲۹۹۔ اسرار احمد سہاوری، پروفیسر، ''سرمایۂ حیات''، فروغِ ادب اکادمی گوجرانوالہ، ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۵

۳۰۰۔ ہفت روزہ، ''ہلال'' راولپنڈی، ۲۰ جنوری ۱۹۷۸ء، ص ۲۴

۳۰۱۔ عاکف سنبھلی، ایضاً، ص ۱۱۴

۳۰۲۔ علی محمد خان، ڈاکٹر، ''لاہور کا دبستانِ شاعری''، نشریات، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۸۴

☆☆☆☆☆

مثال پبلشرز کی دیگر مطبوعات

مطالعہ راشد [چند نئے زاویے]	ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری	500
ن م راشد کی نظموں کے انگریزی تراجم	ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری	700
مکتوباتِ ن۔م۔راشد	ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری	600
جدید اُردو نظم میں نفسیاتی عناصر	ڈاکٹر عنبرین منیر	1200
منٹو — غالب کا پرستار	پرویز انجم	300
تحریر اساس تنقید	قاضی افضال حسین (انڈیا)	300
فیض کی شاعری میں پنجاب رنگ	ڈاکٹر اصغر علی بلوچ	200
لسانی مطالعے	پروفیسر غازی علم الدین	460
تخلیقی زاویے [ادبی اور شخصی مطالعے]	پروفیسر غازی علم الدین	500
تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات	ڈاکٹر اشرف کمال	350
کرشن چندر کے ناول (تحقیقی وتنقیدی مطالعہ)	آنسہ احمد سعید	550
مابعد جدیدیت (فلسفہ وتاریخ کے تناظر میں)	ڈاکٹر اقبال آفاقی	550
راشد۔میراجی۔فیض (نایاب ہیں ہم)	محمد حمید شاہد	600
اُردو فکشن: نئے مباحث	محمد حمید شاہد	600
تعبیر وتفہیم	عبدالعزیز ملک	400
حسن منظر — شخصیت وفن	محرونہ لغاری	600
وزیر آغا کی نظم نگاری	ڈاکٹر محسن عباس	600
خوشاب کا ادبی ورثہ	ڈاکٹر محسن عباس	800
گوہرِ ادب [اصنافِ نظم ونثر کا مفصل جائزہ]	صدف نقوی	500
اُردو افسانے میں خیر وشر کا تصوّر	ڈاکٹر راحیلہ بشیر	700
صورتِ معنی، معنیٔ صورت (مجید امجد کی سوانح اور نظموں کے تنقیدی مطالعے)	ترتیب وتہذیب: جنید امجد	400
مجید امجد شناسی بحوالہ مجلّہ اوراق	ترتیب وتہذیب: ڈاکٹر سیّد عامر سہیل	400
منٹو اور موپاساں (ایک تقابلی مطالعہ)	ڈاکٹر ریاض قدیر	400

رہ ورسم تحقیق (تحقیق)	ڈاکٹر شاہدہ یوسف	260
افسانہ شناسی	ڈاکٹر سبینہ اویس	800
اُردو افسانے کی تنقید اور شمس الرحمٰن فاروقی	غلام عباس	400
تحقیق اور علم التحقیق	ڈاکٹر محمد جمیل اختر	300
غزلیاتِ جوش	تحقیق وتدوین: وسیم عباس	400
افسانوی نثر پر تحقیق [آزادی کے بعد]	ڈاکٹر سکندر حیات میکن	500
اُردو میں سوانحی تحقیق [نمائندہ موضوعات کا مطالعہ وجائزہ]	ڈاکٹر سکندر حیات میکن	500
اُردو شاعری پر تحقیق [آزادی کے بعد]	ڈاکٹر سکندر حیات میکن	500
تحریکات وتنقیدات [آزادی کے بعد]	ڈاکٹر سکندر حیات میکن	500
غیر افسانوی نثر پر تحقیق [آزادی کے بعد]	ڈاکٹر سکندر حیات میکن	400
شہزاد احمد کے شعری افکار	مرتب: اسد عباس عابد	440
کلیاتِ نثرِ منیر نیازی	ترتیب وتہذیب: ڈاکٹر سمیرا اعجاز	1000
ماخذات [تحقیقی وتنقیدی مضامین]	ڈاکٹر سمیرا اعجاز	350
اُردو ناول میں مذہبی عناصر اور بانو قدسیہ	ڈاکٹر محمد نواز کنول	300
تحقیقی وتنقیدی جائزے	ڈاکٹر محمد نواز کنول	300
ادبی تنقید کی تاریخ (مصنف: اکبر لغاری)	ترجمہ: شہناز شورو	400
غزل گو شہزاد احمد	اسد عباس عابد	500
اُردو غزل میں عورت کا تصور	ڈاکٹر محمد جاوید پتافی	1000
کلامِ غالب کی دو مستند شرحیں	ترتیب وتدوین: حنا جمشید	600
اُردو نظم ہیئت اور تکنیک [اوراق کے منتخب مضامین]	مرتب: خوشحال ناظر	500
مختار مسعود کا اسلوب	ڈاکٹر الطاف یوسف زئی	300
شفیق الرحمٰن: حیات وادبی خدمات	ڈاکٹر ریاض حسین	500
فکر وانتقاد (مجموعۂ مقالات)	ڈاکٹر اسلم انصاری	600
انتظار حسین کہانی اور تفہیم	محمد ارسلان رضا، ثنا طارق، دلاور عباس	500

دیگر تصانیف

۱۔ آشوبِ زیست
۲۔ رفاقتوں کی فصلیں
۳۔ اُردو ادب اور عساکرِ پاکستان (جلد اوّل، حصہ اوّل)
۴۔ اُردو ادب اور عساکرِ پاکستان (جلد دوم، حصہ اوّل)
۵۔ اُردو نعت اور عساکرِ پاکستان
۶۔ نعتِ رسولِ مقبول اور سرگودھا کے شعرا
۷۔ کراچی کے نعت گو شعرا
۸۔ جادۂ شوق و محبت
۹۔ اُردو ادب اور عساکرِ پاکستان (جلد اوّل، حصہ دوم)
۱۰۔ سندھ کے نعت گو شعرا
۱۱۔ جلتے صحراؤں میں
۱۲۔ راولپنڈی کے نعت گو شعرا
۱۳۔ بیرک نامہ
۱۴۔ ہتھیلی پہ سورج
۱۵۔ اسلام آباد کے نعت گو شعرا
۱۶۔ مضباچے
۱۷۔ سرِ عکس
۱۸۔ سُنجیاں گلیاں سجریاں راہواں
۱۹۔ وجدان کی آنکھ
۲۰۔ کچھ بھی نہ کہا
۲۱۔ نعت گویانِ سرگودھا
۲۲۔ وجدان کی دوسری آنکھ
۲۳۔ افضل تحسین کی حمد و نعت نگاری
۲۴۔ ریاضت
۲۵۔ لیکھ لکھتاں
۲۶۔ سرگودھا کا دبستانِ شاعری (جلد اوّل)
۲۷۔ عکسِ سرستان
۲۸۔ تحمینِ زبان و ادب
۲۹۔ سرگودھا کا دبستانِ شاعری (جلد دوم)
۳۰۔ خلعتِ توقیر
۳۱۔ نغمۂ محمدی سے نکلی ہوئی آب جو
۳۲۔ مقالاتِ نو
۳۳۔ مطالعاتِ شاکر کنڈان
۳۴۔ اُردو کی بنیاد میں اُردو کا حصہ

Ph:+92-41-2643841, Cell:0300-6668284